بابا تاج الدینؒ

خواجہ شمس الدین عظیمی

عارف باللہ خاتون

مریم اماں

کے نام

جن کے لئے شہنشاہ ہفت اقلیم حضرت باباتاج الدینؒ

کاارشاد ہے:

"میرے پاس آنے سے پہلے مریم اماں کی خدمت میں

حاضری دی جائے۔"

فہرست

اقتباس: *انسان پابہ گل ہے، جنات پابہ ہیولیٰ ہیں، فرشتے پابہ نور، یہ تفکر تین قسم کے ہیں اور تینوں کائنات ہیں۔

* تفکر کے ذریعے ستاروں ، ذروں اور تمام مخلوق سے ہمارا تبادلۂ خیال ہوتا رہتا ہے۔ ان کی انا کی لہریں ہمیں بہت کچھ دیتی ہیں اور ہم سے بہت کچھ لیتی بھی ہیں۔ تمام کائنات اس وضع کے تبادلۂ خیال کا ایک خاندان ہے۔

* خیالات روشنی کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ روشنی کی چھوٹی بڑی شعاعیں خیالات کے لاشمار تصویرخانے لے کر آتی ہیں۔ ان ہی تصویرخانوں کو تو ہم ، تخیلی، تصور اور تفکر وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔

* سائنس داں روشنی کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ اتنی تیز رفتار ہوتی ہیں کہ زمانی مکانی فاصلوں کو منقطع کر دے۔ البتہ انا کی لہریں لا متناہیت میں بہ یک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ زمانی مکانی فاصلے ان کی گرفت میں رہتے ہیں۔

* ساری کائنات میں ایک ہی لاشعور کارفرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب و شہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے۔ چاہے یہ دونوں لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔

* ہم تفکر اور توجہ کر کے اپنے سیارے اور دوسرے سیاروں کے اثار واحوال کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ مسلسل توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے سراپا کا معین پرت انا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز دیکھتا سمجھتا اور شعور میں محفوظ کر دیتا ہے۔

تذکرہ تاج الدین باباؒ
تصنیف قلندر باباؒ اولیاءؒ

شہنشاہ ہفت اقلیم، تاج الدین الملّت والدین، حامل علم لدنی، واقف اسرارِ کائنات حضرت باباتاج الدین ناگپوریؒ کی ذات بابرکات پر قلم اٹھانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ حضرت باباتاج الدینؒ کے نواسے اور سلسلۂ عظیمیہ کے بانی ابدالِ حق قلندر بابااولیاءؒ کا ارشاد ہے کہ "ناناتاج الدین جیسی برگزیدہ ہستی ساڑھے تین ہزار سال میں اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی کرم سے پیدا کرتا ہے۔ یہ ساری کائنات چار نورانی آبشاروں پر قائم ہے۔ ناناتاج الدین کی عظمت کا حال یہ ہے کہ نور اور تجلیات کی ان چاروں آبشاروں کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیتے ہیں کہ ایک قطرہ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کا عالم یہ ہے کہ حضور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرزند کی کوئی بات کبھی نامنظور نہیں کی۔"

باباتاج الدین ناگپوریؒ کے حالات اور کشف وکرامات پر گزشتہ ستّر پچھتر سالوں میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں اردو کے علاوہ گجراتی اور ہندی زبان میں شائع شدہ کتابیں بھی ہیں۔ حضرت باباتاج الدین ناگپوریؒ کے علم وعرفان اور غیب وشہود کے وارث قلندر اولیاءؒ نے تذکرہ تاج الدین بابا کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی۔ روحانی دنیا میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں کشف وکرامات کی علمی توجیہ بیان کی گئی ہے اور باباتاج الدین کے ان علوم کا ذکر کیا گیا ہے جن علوم کا تعلق براہ راست ان چار نورانی آبشاروں کے ساتھ ہے جو باباتاج الدین کی رُوح کے اندر ہمہ وقت تسلسل کے ساتھ جذب ہوتی رہتی ہیں۔ تذکرہ تاج الدین بابا کی اشاعت کے بعد مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی نے مجھ سے بار بار کہا کہ حضرت باباتاج الدین ناگپوریؒ کے حالات زندگی پر ایک بھرپور کتاب لکھو۔

قانون یہ ہے کہ جب کسی ایک بات پر عارف باللہ کا ذہن مرکوز ہو جائے تو اس کا مظاہرہ ایک امر لازمی ہو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آنکھوں کے نور میرے روحانی باپ حضرت حواجہ شمس الدین عظیمی کا یہی ذہن روحانی تصرف کے ذریعے جب مجھے منتقل ہوا تو کتاب کی ترتیب و تالیف کا کام شروع ہو گیا۔ مرشد کریم کے تصرف، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظرِ رحمت سے کتاب پوری ہوئی جو آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تحریر آسان ہو اور طوالت قاری کے اوپر گراں نہ گزرے۔ زیرِ نظر کتاب میں اجمال اور تفصیل کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ حضرت باباتاج الدین ناگپوریؒ کی ہستی سے متعلق زیادہ سے زیادہ گوشے دائرہ تحریر میں آجائیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ حضرت باباتاج الدین ناگپوریؒ جیسی ہمہ صفت، عظیم المرتبت اور عارف ذات (جلّ جلالہٗ) ہستی پر کچھ لکھنا اور اس کا حق ادا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر بھی جو کچھ جہاں سے بھی ملا میں نے کم سے کم صفحات پر اسے بکھیر دیا ہے۔

حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے حالات اور کشف و کرامات کی تالیف وتدوین میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان میں جناب قطب الدین کی کتاب "تاج قطبی" حضرت فرید الدین المعروف کریم باباتاجی کی تالیف "تاج مراری" اور باباذہین شاہ تاجی کی کتاب "تاج اولیاء" شامل ہیں۔ میں روحانی ڈائجسٹ کے ایڈیٹر جناب حکیم وقار یوسف عظیمی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تالیف وتدوین میں ہر ممکن تعاون کیا۔ اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو قبول فرمائے۔آمین!

سہیل احمد عظیمی

۲؍ذی قعد ۱۴۰۵ھ

مطابق

۲۱؍جولائی ۱۹۸۵ء

روحانی انسان

کائنات میں رنگ رنگ عجائبات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں دو رخ نظر آتے ہیں۔ایک رخ انکار و شکوک وشبہات پر قائم ہے اور دوسرا رخ یقین اور سچائی پر قائم ہے۔ کائنات میں انکار اور اقرار کے یہ دونوں رنگ ہر لمحہ اور ہر آن متحرک رہتے ہیں۔ یقین اور اقرار کا تذکرہ سچائی اور راست بازی سے کیا جاتا ہے۔ جس طرح انکار کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح سچائی اور راست بازی کا تذکرہ بھی ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ عام طور پر اس لفظ کی معنویت اور طاقت پر بہت کم غور کیا جاتا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جیسے ہی یہ لفظ زبان پر آتا ہے کہنے والا اپنے اندر لامحدود طاقت کے چشمے ابلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ کائنات کی ساری طاقتیں اسی لفظ میں پوشیدہ ہیں اور راست بازی قدرت کا دوسرا نام ہے۔ ہم جس چیز کو غیب کے نام سے جانتے ہیں وہ بھی دراصل راست بازی کی چھپی ہوئی طاقتوں کا ایک مربوط نظام ہے۔ نبی اور رسولوں کے ذریعے دنیا میں جتنے بھی غیر معمولی مذاہب رونما ہوئے ان سب نے راست بازی کے خدوخال میں نشوونما پائی۔ نبی اور رسولوں کی بعثت کا سلسلہ جب ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی سنّت کے

مطابق، انبیاء کے شاگردوں کو انبیاء کی طرزِ فکر منتقل ہوتی رہی۔ لوگ پیدا ہوتے رہے اور انبیاء کرام کے علوم ان پاکیزہ نفس حضرات کو منتقل ہوتے رہے۔ عرف عام میں ان ہی باحوصلہ، باعزم، باہمت اور راست باز لوگوں کو اولیاءاللہ کہا جاتا ہے۔ یہ اولیاءاللہ دراصل شکل وصورت میں، فکر و نظر میں اور حیات و ممات میں راست بازی کے نقوش ہیں۔ سچائی اور راست بازی ان شخصیتوں میں رواں دواں رہتی ہے۔ ان کی پیشانیوں پر ضوفشاں رہتی ہے۔ ان کی نورانی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی بصیرت اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ راست بازی کے پیغامات ہوتے ہیں۔ اور یہی نوعِ انسان کا حقیقی سرمایہ ہیں۔

ماضی ہو، دورِ ماضی کی مادّی ترقیاں ہوں یا مستقبل میں زمین و آسمان کو ایک بنا دینے والی ایجادات ہوں بہر کیف عارضی اور فنا ہو جانے والی ہیں لیکن اہلِ زمین کے لئے راست بازی ایک ایسا سرمایہ ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ اس لا متناہی اور ہمیشہ قائم رہنے والے سرمائے کا نام حقیقی دنیا میں روحانیت ہے۔ جن شخصیتوں اور قدسی نفس حضرات کو یہ سرمایہ حاصل ہے وہ انسانی زندگی کا جوہر ہیں۔ ان کے فیض سے انسانی چہروں میں سادگی و پاکیزگی، انسانی قدر و قامت میں صبر و عزم، انسانی قلب میں نور اور روشنی کی تحریکات ملتی ہیں۔ یہ روشن اور منوّر لوگ اندھیروں اور اجالوں کے درمیان حدِّ فاصل ہیں۔

ترقی اور تہذیب کے نت نئے شگوفے انسانیت کے ماتھے پر جھومر نہیں سجا سکے۔ لیکن ان پاکیزہ خیالات لوگوں نے ہمیشہ نوعِ انسانی کو سکون و راحت کی دولت سے نوازا ہے۔ آج بھی یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجسم پیغام ہیں۔ ان کی پیشانیوں سے وہ شعاعیں نکلتی ہیں جن شعاعوں کے ذریعے فرش والے عرش پر متمکن ہو جاتے ہیں اور

اللہ کی آواز صوتِ سرمدی بنکران کے کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے۔ نگاہ اوپر اٹھتی ہے تو تجلیات کا ہجوم ان کا استقبال کرتا ہے۔

ان ہی پاکیزہ، باکردار اور مقدّس و مطہّر حضرات میں علم و عرفان سے آراستہ ایک ہستی حضرت بابا تاج الدین ناگپوری رحمۃاللہ علیہ ہیں۔

جس طرح روشنی کے ظہور کے لئے میڈیم (بلب) کا ہونا ضروری ہے اسی طرح قدرت کا چلن یہ ہے کہ وہ خود کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں منعکس کرنے کے لئے اپنا ایک میڈیم کا عمل ہوتا ہے۔ قدرت جو کچھ دکھانا چاہتی ہے، وہ سب اس کی آنکھوں میں عکس ریز رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی کے ایک ایک لمحے پر قدرت کے سربستہ راز محیط ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ پاکیزہ حضرات اعلیٰ ترین انسانی صلاحیتوں سے متصف ہوتے ہیں۔

حضرت بابا تاج الدینؒ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے دماغ پسِ پردہ عمل میں آنے والے مناظر کو براہِ راست دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کا ذہن خیال اور تصور میں بھی مشیّت کے اشارے تلاش کر لیتا ہے۔ ایسے حضرات کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں کام کرتی ہیں۔ اتنی غیر معمولی صلاحیتیں کہ جو چیزیں سامنے نہیں ہوتیں وہ ان کو بھی سامنے لے آتی ہے۔ ان کے ذہن کے ساتھ کائنات کی ہر شئے حرکت کرتی ہے۔

قدرت اپنی صناعی کو متعارف کرانے کیلئے ایسے حضرات پیدا کرتی ہے جو قدرت کے امین ہوں۔ قدرت کا یہی جذبہ بابا تاج الدین جیسی ہستی کی پیدائش کا باعث بنتا ہے۔ جس طرح کوئلہ ایک پتھر ہے اور ہیرا بھی پتھروں کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح ہم انسانوں کی دنیا میں بابا تاج الدینؒ بھی ایک ہیرا تھے جسے مشیّتِ ایزدی نے تراش خراش کے مراحل سے گزار کر رنگ و نور کا مجموعہ بنا دیا تھا۔

اولیاءاللہ اور عارف باللہ حضرات کی تاریخ میں باباصاحب کی ذات ایک پورا باب ہے۔ ایسا باب جس کو پوری طرح سمجھنا ہم جیسے لوگوں کے لئے تو کُجا بڑے بڑے لوگوں کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی جو کچھ باباصاحب سے متعلق ہم تک پہنچا ہے اس کے ذریعے ہم اپنے ذہنوں میں باباصاحب کی ہستی کا ایک خاکہ ضرور بنا سکتے ہیں۔

اسی طرح جس طرح طلوعِ آفتاب سے پہلے ہم سورج کو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو روشنی رات کے سیاہ اندھیرے کو چاک کر دیتی ہے۔ اسے دیکھ کر سورج کی موجودگی اور اس کی عظمت کا تصور ہمارے ذہنوں پر مرتّب ہو جاتا ہے۔ اہلِ نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ باباصاحب جیسی عظیم المرتبہ ہستی ساڑھے تین ہزار سال میں پیدا ہوتی ہے۔

باباتاج الدین کا تذکرہ کوئی قصہ پارینہ نہیں ہے۔ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے باباصاحبؒ کو دیکھا ہے، ان کی باتیں سنی ہیں۔ ان کے انداز واطوار کو مشاہدہ کیا ہے۔ ماضی قریب میں بہت سے لوگ ہم سے جدا ہو گئے۔ جن کی آنکھیں باباصاحب کی شانِ جلال وجمال کی امین تھیں۔ ان لوگوں میں عام طبقے سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہایت قابل اور مقتدر افراد شامل ہیں۔ ان حضرات نے جب بھی بابا صاحب کا ذکر کیا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ اندازِ بیان میں تبدیلی آجاتی ہے۔ احترام، عقیدت اور اعترافِ عظمت ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکنے لگتا ہے۔

باباتاج الدین نہ کوئی حاکم تھے نہ آپ کے پاس دولت کی قوت تھی، نہ ہی مذہبی اقتدار حاصل تھا۔ پھر بھی نہ جانے کون سی حکومت اور خوبی انہیں حاصل تھی کہ حکمرانوں، نوجوانوں اور رؤسا کی پیشانیاں اس فقیر کے دربار میں جھک جھک گئیں۔ ۳۵ سال تک لوگ قطار در قطار کھنچے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔

باباصاحب کا یہ بہت بڑااعجاز ہے کہ مسلسل ۳۵ سال عوام میں رہ کر ان کی حاجت روائی فرمائی۔لوگ حاضرِ خدمت ہوتے تو سب دُکھ بھول جاتے اور یوں لگتا جیسے خوشی اور اطمینان ان کے خون کے ساتھ دوڑنے لگا ہے۔لوگ وہ مسرتیں حاصل کرتے جو دنیا کے سارے وسائل فراہم ہونے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ سادگی اور خلوص کے اندرونی چشمے یک دم ابل پڑتے۔ایسا معلوم ہوتا کہ ساری آلائشیں دھل گئی ہیں۔اور دماغ پاکیزگی اور لطافت سے معمور ہو گیا ہے۔

باباصاحب کی زبانِ مبارک حق کی آواز تھی۔ ان کی جامع صفاتِ ہستی پر حدیثِ قدسی کے یہ الفاظ پوری طرح صادق آتے ہیں۔

"اے میرے بندے! میری اطاعت کر، میں تجھے اللہ والا بنادوں گا۔ پھر تو جس چیز کو کہے گا ہو جا، وہ ہو جائے گی۔"

آج ناگپور کی وجہِ تعارف باباتاج الدین ہیں۔ناگپور کا نام آتے ہی باباصاحب کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔صرف ناگپور ہی میں نہیں، ہر جگہ باباصاحب کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔آج بھی لاکھوں دلوں پر باباصاحب کی حکومت قائم ہے۔ بابا کے نام کے ساتھ لاکھوں دلوں میں عقیدت و محبت کے بے لوث جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔
لاکھوں گھروں میں باباصاحب کی آویزاں تصاویر اس تعلق خاطر کی گواہ ہیں۔
آج بھی باباتاج الدین کا نام پردہ سماعت سے ٹکراتا ہے یا نگاہ ان کی تصویر پر پڑتی ہے تو لگتا ہے کہ باباصاحب اپنی شانِ ولایت سے جلوہ افروز ہیں۔ بے شک ایسے قدسی نفس

حضرات کو موت فنا نہیں کر سکتی۔ وہ اَمر ہیں۔ زندگی ان کی آغوش میں کروٹیں لے رہی ہے لیکن ہمیں شعور نہیں ہے۔

حالاتِ زندگی

نام اور القاب:

آپ کا نام محمد تاج الدین تھا اور پیار سے چراغ دین کہلاتے تھے۔ عرف عام میں تاج الدین بابا کہلائے۔ آپ کے القاب یہ ہیں۔

تاج الاولیاء

تاج الملت والدّین

تاج العارفین

تاج الملوک

سراج السالکین

شہنشاہ ہفت اقلیم

شہنشاہ ہفت اقلیم باباصاحب کا ایسا لقب ہے جو تشریح و توضیح طلب ہے۔ اس کی مختصر تشریح یوں ہے کہ تمام عالم کو اللہ تعالیٰ کے نظامِ تکوین میں سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو سات (ہفت) اقلیم کہلاتے ہیں۔ چنانچہ باعثِ تکوینِ کائنات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ نائب جس کے انتظام واختیار میں ساتوں اقلیم ہوتے ہیں۔ شہنشاہِ ہفت اقلیم کہلاتا ہے۔

خاندان:

باباتاج الدین اولیاءؒ کا سلسلۂ نسب امام حسن عسکری سے ملتاہے۔ امام حسن عسکری کی اولاد میں فضیل مہدی عبداللہ عرب، ہندوستان تشریف لائے اور جنوبی ہندکے ساحلی علاقے مدراس میں قیام کیا۔ حضرت فضیل مہدی عبداللہ کے دو صاحبزادے حسن مہدی جلال الدین اور حسن مہدی رکن الدین سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ باباتاج الدین حسن مہدی جلال الدین کی اولاد میں سے ہیں۔

باباصاحب کے بزرگوں میں جناب سعدالدین مہدی مغلیہ دور میں فوجی افسر ہو کر دہلی آئے۔ بادشاہ دہلی کی طرف سے اہار نام کا ایک موضع بطور جاگیر انہیں دیا گیا۔ فرّخ سیر کے دور میں صوبے کے گورنر نواب عالا گڑھ نے ناراض ہو کر حقوقِ جاگیر داری ضبط کر لئے۔ صرف کاشتکاری کی حیثیت باقی رہ گئی۔

باباتاج الدین کے دادا کا نام جمال الدین تھا۔ بابا صاحب کے والد جناب بدرالدین مہدی تھے جو ساگر ڈپو میں صوبے دار تھے۔ اور ان کی سکونت اہار میں تھی۔ ساگرہندوستان کے صوبے سی۔پی میں واقع ہے۔ باباصاحب کی والدہ کا نام مریم بی تھا۔

پیدائش:

حسن مہدی بدرالدین کی اہلیہ مریم بی صاحبہ نے ایک نہایت تاثرانگیز خواب دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چاند آسمان پر پوری آب وتاب سے چمک رہاہے اور ساری فضا چاندنی سے معمور ہے۔ یکایک چاند آسمان سے گیند کی طرح لڑھک کر ان کی گود میں آ گرا۔ اور کائنات اس کی روشنی سے منوّر ہو گئی۔ اس خواب کی تعبیر باباتاج الدینؒ کی پیدائش کی صورت میں سامنے آئی۔

عام روایت کے مطابق باباتاج الدینؒ اولیاء ۵؍رجب المرجب ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۷؍جنوری ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش پیر کے دن فجر کے وقت بمقام کامٹی، ناگپور میں ہوئی۔ قلندر بابا اولیاءؒ (نواسہ باباتاج الدینؒ) نے کتاب "تذکرہ تاج الدین باباؒ" میں لکھا ہے:

"تحقیق و تلاش کے بعد بھی ناناتاج الدین کا سالِ پیدائش معلوم نہیں ہو سکا۔ بڑے نانا (باباتاج الدین کے بھائی) کی حیات میں مجھے زیادہ ہوش نہیں تھا۔ والد صاحب کو ان باتوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں نے بڑے نانا کی زبانی سنا ہے کہ تاج الدین کی عمر غدر میں (یعنی ۱۸۵۷ء میں) چند سال تھی۔"

ان دونوں روایتوں کو سامنے رکھا جائے تو باباصاحب کی سنِ پیدائش میں چند سال کا فرق پڑتا ہے۔

عام بچوں کے برعکس باباصاحب پیدائش کے وقت روئے نہیں بلکہ آپ کی آنکھیں بند تھیں اور جسم ساکت تھا۔ یہ دیکھ کر وہاں موجود خواتین کو شبہ ہوا کہ شاید بچہ مردہ پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ قدیم قاعدہ کے مطابق کسی چیز کو گرم کر کے پیشانی اور تلووں کو داغا گیا۔ باباصاحب نے آنکھیں کھولیں، روئے اور پھر خاموش ہو کر چاروں طرف ٹک ٹک دیکھنے لگے۔

بچپن اور جوانی:

باباتاج الدینؒ کی عمر ابھی ایک برس تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گا اور جب آپ نو سال کے ہوئے تو والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ والدین کے انتقال کے بعد نانا، نانی اور ماموں نے باباصاحب کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

چھ سال کی عمر میں باباصاحب کو مکتب میں داخل کر دیا گیا تھا۔ایک دن مکتب میں درس سن رہے تھے کہ اس زمانے کے ایک ولی اللہ حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ مدرسے میں آئے اور استاد سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ لڑکا پڑھا پڑھایا ہے،اسے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لڑکپن میں باباتاج الدینؒ کو پڑھنے کے علاوہ کوئی شوق نہ تھا۔آپ کھیل کود کے بجائے تنہائی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔پندرہ سال کی عمر تک آپ نے ناظرہ قرآنِ پاک،اردو،فارسی اور انگریزی کی تعلیم پائی۔

فوج میں شمولیت:

ایک مرتبہ ناگپور کی کنہان ندی میں شدید طغیانی آگئی اور سیلاب میں باباصاحب کے سرپرستوں کا سارا سامان بہہ گیا۔بے سروسامانی باباصاحب کی ملازمت کا فوری سبب بنی۔باباصاحب نے فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔اور ناگپور کی رجمنٹ نمبر ۸؍ (مدراسی پلٹن) میں شامل کر لئے گئے۔اس وقت آپ کی عمر ۱۸؍ سال تھی۔

کچھ عرصہ بعد باباصاحب کی رجمنٹ کا تقرر ساگر میں کر دیا گیا۔باباتاج الدینؒ کے نواسے قلندر بابااولیاءؒ لکھتے ہیں:

ناناتاج الدین فوج میں بھرتی ہونے کے بعد ساگر ڈپو میں تعینات کئے گئے تھے۔رات کے ۹؍ بجے گنتی سے فارغ ہو کر باباداؤد مکّی کے مزار پر تشریف لے جاتے۔ وہاں صبح تک مراقبہ اور مشاہدہ میں مصروف رہتے اور صبح سویرے پریڈ کے وقت ڈپو میں پہنچ جاتے۔ یہ مشغلہ پورے دو سال تک جاری رہا۔دو سال بعد بھی ہفتہ میں ایک دو

باران کے یہاں حاضری ضرور دیا کرتے تھے۔ جب تک ساگر میں رہے اس معمول میں فرق نہیں آیا۔

کامٹی میں باباتاج الدین کی نانی کو جب اس بات کی خبر ملی کہ نواسہ راتوں کو غائب رہتاہے تو خیال آیا کہ شاید آپ بری صحبتوں کا شکار ہو کر بے راہ رو ہو گئے ہیں۔ یہ سوچ کر نانی صاحبہ ساگر جاکر ٹھہریں تا کہ یہ معلوم کریں کہ نواسہ راتوں کو کہاں رہتاہے۔ نانی نے اس خبر کو سچ پایا کہ نواسہ رات کو کہیں جاتاہے۔ ایک رات کہیں باہر رہ کر صبح باباصاحب گھر آئے تو نانی نے ناشتہ سامنے رکھا۔ باباصاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ اس جواب سے نانی مزید فکر مند ہوئیں اور پکاارادہ کر لیا کہ رات کو نواسے کا تعاقب کر کے دیکھیں گی کہ وہ کہاں جاتاہے۔

رات کو جب باباصاحب ویرانے کی طرف روانہ ہوئے، نانی بھی نظر بچاکر چپکے چپکے ہولیں۔ دیکھا کہ نواسہ ایک مزار کے اندر داخل ہوا۔ چندے انتظار کے بعد اندر جاکر دیکھا تو باباصاحب ذکر و فکر میں مشغول تھے۔ نواسے کی عبادت وریاضت میں حد درجہ مستغرق دیکھ کر نانی صاحبہ کے دل کا بوجھ اتر گیا۔ انہوں نے باباصاحب کو بہت دعائیں دیں اور خاموشی سے واپس چلی آئیں۔

باباصاحب صبح کو نانی کے پاس آئے توان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ نانی صاحبہ نے ناشتہ پیش کیاتو باباصاحب بے پتھر دکھاتے ہوئے کہا۔

"نانی! میں تولڈو پیڑے کھاتاہوں۔"

یہ کہہ کر باباصاحب نے پتھروں کو یوں کھانا شروع کیا جیسے کوئی مٹھائی کھاتاہے۔ نواسے کی یہ کیفیت دیکھ نانی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دونوکریاں نہیں کرتے:

رفتہ رفتہ باباتاج الدین کی طبیعت میں استغراق پیدا ہونے لگا۔ ان ہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہو جس نے باباصاحب کی زندگی کے اگلے دور کی بنیاد ڈالی۔ باباصاحب کی ڈیوٹی اسلحے کے ذخیرے پر لگائی گئی تھی۔ ایک رات دو بجے جب باباصاحب اسلحے کے ذخیرے پر پہرے دے رہے تھے، انگریز کیپٹن اچانک معائنہ کے لئے آگیا۔ باباصاحب کو تندہی سے پہرہ دیتے دیکھ کر واپس ہوا۔ تو نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد کے پاس سے گزرا۔ مسجد کا صحن چاندنی رات میں صاف نظر آرہا تھا۔ کیپٹن نے دیکھا کہ وہ جس سپاہی کو پہرہ دیتے دیکھ کر آیا ہے وہ خشوع و خضوع کے ساتھ صحنِ مسجد میں نماز ادا کر رہا ہے۔ سپاہی کو ڈیوٹی سے غفلت برتتے دیکھ کر اسے سخت غصہ آیا۔ وہ اسلحہ خانہ میں واپس آیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر سپاہی پکارا "ہالٹ" کیپٹن آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سپاہی (باباصاحب) اسی جگہ موجود ہے۔ کچھ کہے بغیر اس نے مسجد کا رخ کیا جہاں وہ سپاہی کو نماز میں مشغول دیکھ چکا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ باباصاحب اسی طرح محویت کے عالم میں مصروفِ عبادت ہیں۔ وہ ایک بار پھر تصدیق کے لئے اسلحہ خانہ پہنچا تو باباصاحب کو ڈیوٹی پر موجود پایا۔ دوسری بار مسجد جا کر دیکھا تو وہی منظر سامنے تھا۔

دوسرے روز اس نے اپنے بڑے افسر کے سامنے باباصاحبؒ کو طلب کر کے کہا۔ ہم نے تم کو رات دو دو جگہ دیکھا ہے۔ ہم سمجھتا ہے کہ تم خدا کا کوئی خاص بندہ ہے۔" یہ سننا تھا کہ باباتاج الدینؒ کو جلال آگیا۔ سرکاری وردی اور دوسرا سامان کیپٹن کے سامنے لا کر رکھا اور اپنے مخصوص مدراسی لہجے میں فرمایا:

"لو جی حضرت! اب دو دو نوکریاں نہیں کرتے جی حضرت۔"

یہ کہہ کر صاحب جذب و جلال میں فوجی احاطے سے باہر نکل آئے۔ کامٹی میں رشتہ داروں کو یہ اطلاع دی گئی کہ باباصاحب پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اور انہوں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ نانی بے تاب ہو کر ساگر آئیں اور دیکھا کہ نواسے پر بے خودی طاری ہے۔ وہ باباصاحب کو کامٹی لے گئیں اور وساعتی مریض سمجھ کر ان کا علاج شروع کیا۔ لیکن کوئی مرض ہوتا تو علاج کارگر ہوتا۔ چار سال تک باباتاج الدینؒ پر جذبہ و استغراق کا شدید غلبہ رہا۔ لوگ ان کو مخبوط الحواس سمجھ کر چھیڑتے اور تنگ کرتے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مجزوبانہ کیفیات میں ہوش کے اشارے اور ولایت کا رنگ دیکھ کر باباصاحب کا احترام کرتے تھے۔

نسبتِ فیضان:

اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ باباتاج الدینؒ نے کسی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ معتبر ذرائع بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس عالمِ رنگ و بو میں آپ کا پیر و مرشد کوئی نہیں تھا۔ پھر دو ہستیاں ایسی ہیں جن سے صرف قربت اور نسبت ثابت ہے۔ ایک سلسلۂ قادریہ کے حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ، دوسرے سلسلۂ چشتیہ کے باباداؤد مکّیؒ۔

حضرت عبداللہ شاہ صاحب وہی بزرگ ہیں جو باباصاحب کے زمانۂ تعلیم میں مکتب آئے تھے اور استاد کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یہ لڑکا (باباتاج الدینؒ) پڑھا پڑھایا ہے اسے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ کا مزار کامٹی اسٹیشن کے پاس ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں باباتاج الدینؒ حضرت عبداللہ شاہ صاحب کی خدمت

میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ شاہ کے سجادہ نشین کی روایت کے مطابق جب عبداللہ شاہ صاحبؒ کے وصال کا وقت قریب آیا۔ تو باباتاج الدینؒ اُن کے پاس آئے۔ اس وقت شربت بنا کر شاہ صاحب کو پیش کیا گیا۔ انہوں نے چند گھونٹ پی کر باباصاحب کو پلا دیا۔

بابا داؤد مکیؒ خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے خلیفہ تھے۔ اور خواجہ شمس الدین ترکؒ کو مخدوم علاؤالدین علی احمد صابر کلیریؒ سے خلافت ملی تھی۔ بابا داؤد مکیؒ مرشد کی حکم پر ساگر آئے۔ اور یہیں وصال فرمایا۔ ان کو بظاہر کوئی خلیفہ نہیں تھا۔ بابا داؤدؒ کے وصال کے کوئی چار سال بعد جب باباتاج الدینؒ فوجی ملازمت کے سلسلے میں ساگر گئے تو آپ نے بابا داؤد مکیؒ کی مزار پر تقریباً دو سال ریاضت و مراقبہ میں گزارے روایات کے مطابق یہیں باباصاحب کو چشتیہ نسبت اویسیہ طریقے پر منتقل ہوئی۔ اویسیہ نسبت وہ نسبت یا رابطہ ہے جس کے تحت سالک کو کسی بزرگ کی روح سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ایسا فیض جو مرشد کے جسمانی طور پر سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اس اسے منتقل ہو۔ یہ وہی نسبت ہے جس کے تحت حضرت اویس قرنیؓ کو سرکارِ دوعالم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علوم وفیوض حاصل ہوئے تھے۔ قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے تھے کہ باباتاج الدینؒ وحضرت عبداللہ شاہؒ کی قربت حاصل ہوئی تھی اور نسبتِ چشتیہ بابا داؤد مکیؒ کی مزار پر منتقل ہوئی تھی۔ لیکن باباصاحب کی تعلیم و تربیت خود جناب سرورِ کائنات ﷺ، حضرت علیؓ، حضرت اویس قرنیؓ نے کی ہے۔ نیز باباصاحب کو ہر سلسلہ کے اکابر اولیاءاللہ کی ارواح سے فیض حاصل ہوا ہے۔ باباتاج الدینؒ کے کئی ارشادات میں اویسیہ فیضان کی طرف اشارہ موجود ہے۔

باباصاحب اپنی ولایت کے رنگ اور نسبت کو اکثر یہ کہہ کر بھی ظاہر کرتے تھے کہ ہمارا نام تاج محی الدین، تاج معین الدین ہے۔

شجرۂ چشتیہ

حضرت سرور کائنات محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علیؓ

حضرت حسن بصریؒ

حضرت عبدالواحد زیدؒ

حضر فضیل بن عیاضؒ

حضرت ابراہیم ادھمؒ

حضرت خواجہ سدیدالدین حذیفہ مرعشیؒ

حضرت ہبیرہ البصریؒ

حضرت ممشاد دینوریؒ

حضرت ابواسحاق شامیؒ

حضرت ابواحمد ابدالؒ

حضرت ابو محمد ابدالؒ

حضرت ناصر الدین ابو یوسفؒ

حضرت قطب الدین مودود چشتیؒ

حضرت حاجی شریف زندنیؒ

حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

حضرت بابافرید الدین گنج شکرؒ
حضرت مخدوم علاؤالدین صابر کلیریؒ
حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ
حضرت باباداؤد مکیؒ
بطریقِ اویسیہ
حضرت باباتاج الدین اولیاءؒ

شجرۂ قادریہ

حضرت سرور کائنات محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
حضرت علیؓ
حضرت امام حسینؓ
حضرت امام زین العابدینؓ
حضرت امام محمد باقرؓ
حضرت امام صادقؓ
حضرت امام موسیٰ کاظمؓ
حضرت امام علی رضاؓ
حضرت معروفِ کرخیؒ
حضرت شیخ صفی الدینؒ
حضرت ابوالحسن سری سقطیؒ
حضرت جنید بغدادیؒ
حضرت ابو بکر شبلیؒ
حضرت عبدالواحد بن عبدالعزیزؒ
حضرت ابوالفرح یوسف طرطوسیؒ
حضرت ابوالحسن علی ہنکاریؒ
حضرت ابو سعید مبارک مخزومیؒ

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ

حضرت عبد العزیزؒ

حضرت سید محمد الهتاکؒ

حضرت سید شمس الدینؒ

حضرت سید شرف الدینؒ

حضرت سید زین الدینؒ

حضرت سید ولی الدینؒ

حضرت سید نور الدینؒ

حضرت سید حسام الدینؒ

حضرت سید نور الدینؒ

حضرت سید محمود درویشؒ

حضرت سید قادریؒ

حضرت عبد الجلیلؒ

حضرت سید عبد اللہ شاہؒ

حضرت باباتاج الدین اولیاءؒ

* حضرت سید عبد اللہ شاہؒ نے باباتاج الدینؒ کو بچپن میں کھجور کھلائی تھی اور اپنے وصال کے وقت شربت پلایا تھا۔

باباصاحب کبھی یہ بھی فرماتے :

ہمارا نام تاج الدین الاولیاء، تاج الملت والدین، شہنشاہ ہفت اقلیم، سید محمد بابا تاج الدین ہے۔

پاگل جھونپڑی:

فوج کی ملازمت کو خیر باد کہنے کے بعد بابا تاج الدینؒ کامٹی میں رہنے لگے تھے۔ اس زمانے میں جذب و بیخودی عروج پر تھی۔ لوگ آپ کے استغراق کو پاگل پن سے تعبیر کرتے لیکن کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی بنا پر لوگوں میں آپ کی شخصیت ایک صاحبِ کرامت اور صاحبِ فیض کی حیثیت سے ابھرنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پریشان حالوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم آپ کے گرد رہنے لگا۔ لوگ ہر وقت آپ کو گھیرے رہتے اور اپنی مشکلات بیان کرتے۔ یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ رات دن ایک ہو گیا۔ ایک روز بابا تاج الدینؒ نے فرمایا:

"لوگ ہمیں بہت ستاتے ہیں۔اب ہم پاگل جھونپڑی چلے جائیں گے۔"

چنانچہ خود بخود ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ آپ کو ناگپور کے پاگل خانے میں بھرتی کر دیا گیا۔تاریخ داخلہ ۲۶ ؍اگست ۱۸۹۲ء تھی۔

باباصاحبؒ نے اس پاگل خانے کو ولی خانے میں تبدیل کر دیا اور جلد ہی پاگل خانے کے منتظمین اور ڈاکٹر سمجھ گئے کہ پاگل خانے میں وارد ہونے والی یہ ہستی مقبولِ بارگاہ ہے۔ پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر عبدالمجید اور ڈاکٹر کاشی ناتھ راؤ آپ کو بہت عزت کا نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی بستر کی صفائی اور خورد و نوش کا انتظام بذاتِ خود کرتے تھے۔ پاگل خانے کے قیام کے زمانے میں بابا تاج الدینؒ پر جذب و استغراق کا غلبہ کم ہو گیا۔ اور آپ اکثر شعوری حالت میں رہنے لگے۔ شعوری حالت میں بھی ان سے اس تواتر اور تسلسل سے کرامات کا ظہور ہوتا تھا کہ گویا وہ ان کے نزدیک خرقِ عادت نہیں بلکہ معمول ہے۔

ایک شام مقررہ وقت پر باباتاج الدینؒ کو ان کے کمرے میں پہنچا کر کمرہ مقفل کر دیا گیا۔ اور پاگل خانے کا صدر دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔ اگلی صبح محافظ نے باباصاحبؒ کو باہر دیکھ ششدر رہ گیا۔ فوراً منتظمین اور ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ وہ لوگ فوراً آئے اور باباتاج الدینؒ کو ساتھ لے کر ان کے کمرے پاس پہنچے۔ کمرے کا دروازہ ہنوز مقفل تھا۔ وہ لوگ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ باباتاج الدینؒ ایک عام آدمی نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اس وقت کچھ نہیں کہا۔ لیکن ان کی عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور اس غیر معمولی واقعے کا چرچا پورے ناگپور میں عام ہو گیا۔ پھر تو لوگ جوق در جوق زیارت کے لئے حاضر ہونے لگے۔ اس کے بعد باباصاحبؒ اکثر صبح کے وقت باہر سے تشریف لاتے اور اپنے کمرے کے پیچھے لان پر پڑی ہوئی کرسیوں اور بینچوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ جاتے۔ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے مسائل کا حل چاہتے۔ باباصاحبؒ اُن کے مسائل کا حل بتاتے۔ پاگل خانے میں باباصاحبؒ کی خدمت میں عوام وخواص کی آمد ورفت اتنی روزافزوں بیٹھتی کہ حکومت نے ملاقاتی فیس مقرر کر دی۔ کچھ دنوں بعد یہ ملاقاتی فیس ختم کر دی گئی۔ باباصاحبؒ کے دربار میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، حاکم محکوم سب حاضری دیتے تھے۔ ان میں سر انتونی میکڈونلڈ چیف کمشنر سی پی وبرار، سول سرجن کرنل رو، ایس پی پولیس موتی ایڈیشنل، اسٹنٹ، کمشنر خان بہادر ولایت اللہ خاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں شکر درا، واکی اور بہت سے علاقے مرہٹہ راجا رگھوجی راؤ کی ملکیت تھے۔ اس کا عالی شان محل اور اس سے متصل کئی میل لمبا باغ شکر درا میں تھا۔ راجا رگھوراؤ کے بیٹے ونایک راؤ کی رانی حاملہ تھی۔ وضعِ حمل کا وقت قریب آیا لیکن پیدائش عمل میں نہیں آئی۔ موقع پر موجود سرجن اور لیڈی ڈاکٹروں کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کامیابی نہیں ہوئی۔ رانی تکلیف سے بے ہوش ہو گئی اور شام تک اس کی حالت میں

کوئی امید افزا تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی۔ شام کو ڈاکٹروں نے مشورہ کیا اور متفقہ فیصلہ دے دیا کہ بچے کی موت واقع ہو چکی ہے۔ اور اگر آپریشن کے ذریعے بچے کو باہر نہ نکالا گیا تو رانی کو موت واقع ہو جائے گی۔ راجہ رگھوراؤ ڈاکٹروں کے اس فیصلے سے تذبذب میں پڑ گئے۔ اوران کے ذہن نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ صبح چھ بجے راجا رگھوجی پوجا سے فارغ ہوئے تھے کہ ان کا موٹر ڈرائیور حاضرِ خدمت ہوا اور اس نے کہا۔

"حضور! میں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر عمل کیجئے۔ آپ میرے ساتھ پاگل خانے چلئے، وہاں ایک بہت بڑے ولی اللہ تشریف فرماہیں۔ سب لوگ ان سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ آپ بھی چھوٹی رانی کے سلسلے میں ان کی خدمت ہو عرض کیجئے۔"

راجا رگھوجی راؤ اسی وقت اٹھے اور ننگے پیر موٹر میں سوار ہو گئے۔ اور ڈرائیور ممکنہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا پاگل خانے کے صدر دروازے سے پر جا رکا۔ پاگل خانے کے منتظمین اور سپرنٹنڈنٹ کو راجہ صاحب کی آمد کا علم ہوا تو وہ فوراً بھاگے ہوئے استقبال کو آئے۔ ڈرائیور نے راجہ صاحب کو وہیں موٹر کے پاس رکنے کو کہا اور خود لان میں حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا۔

"حضور! شکر درا اسٹیٹ کے راج رگھوجی راؤ حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت اور قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

باباصاحبؒ نے فرمایا: "ہم فقیر جی حضرت، ہمارے سے راجہ کا کیا کام جی حضرت۔" ڈرائیور نے بہت منت سماجت کی تو باباصاحبؒ خاموش ہو گئے۔ خاموش کو اجازت سمجھ کر وہ دوڑا ہوا راجہ رگھوجی راؤ کے پاس پہنچا اور کہا۔

"فوراً چلئے اور حضور باباصاحبؒ کے قدم پکڑ لیجئے۔"

راجہ جلد سے اندر پہنچا اور باباصاحبؒ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ بابا صاحبؒ نے اس کو ایک نظر دیکھ کر فرمایا۔

"اِدھر کیا کرتے جی حضرت! اُدھر جانا، لڑکا پیدا ہوا تو خوشیاں منانا۔"

ڈرائیور حضور باباصاحبؒ کا بہت معتقد تھا۔ اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ وہ باباصاحبؒ کے مخصوص لب ولہجہ سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے راجہ سے کہا۔

"راجہ صاحب بس کام ہو گیا۔ واپس چلئے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے گھڑی دیکھ کر وہ وقت نوٹ کر لیا جس وقت بابا صاحبؒ نے متذکرہ بالا جملے ادا کئے تھے۔ واپسی میں راجہ رگھوجی راؤ کی موٹر محل کے صدر دروازے کے قریب پہنچی تو انہیں شہنائیوں اور نفیریوں کی آواز سنائی دی۔ آنے جانے والے ملازمین کے چہروں پر خوشی کے آثار نظر آرہے تھے اور وہ سب ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ موٹر کے رکتے ہی سب لوگوں نے راجہ کی موٹر کو گھیر لیا اور کنور صاحب کی پیدائش کی خوش خبری سنائی۔ راجہ یہ خبر سن کر خوشی سے بے خود ہو گیا۔ اور حکم دیا کہ خزانے کا منہ کھول دیا جائے۔ ڈرائیور نے راجہ سے کہا۔

"سرکار! پنڈتوں سے جو کنور صاحب کی جنم پتری اور جنم کنڈلی بنائیں گے اور ڈاکٹروں سے پیدائش کا صحیح وقت معلوم کرا دیجئے۔"

پنڈتوں اور ڈاکٹروں نے جو وقت بتایا وہ بالکل وہی تھا جس وقت حضور بابا صاحب نے فرمایا تھا۔ اِدھر کیا کرتے جی حضرت! اُدھر جانا، لڑکا پیدا ہوا تو خوشیاں منانا۔"

شکر درہ میں قیام:

باباتاج الدینؒ کی کرامت دیکھ کر راجہ رگھوجی راؤان کا گرویدہ ہو گیا۔ اور بابا صاحب کی محبت وعقیدت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ چیف کمشنر ناگپور کی وساطت سے ضمانت دے کر ستمبر ۱۹۰۸ ءمیں باباصاحبؒ کو پاگل خانے سے شکر درہ اپنے محل میں لے آیا۔ راجہ باباصاحب کو ایک جلوس کی شکل میں اپنے محل لے گیا۔ جلوس میں ہر مذہب وملت کے لوگ شریک تھے۔ راجہ رگھوجی باباصاحبؒ کو ساتھ لے کر ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے سجے سجائے گھوڑوں اوراونٹوں کی قطاریں تھیں اور جلوس کے آگے آگے شاہی بینڈ نغمہ سرائی کرتاہوا چل رہاتھا۔ راستے کے دونوں طرف لوگوں کو ہجوم موجود تھااور لوگ اپنی محبت اور شگفتگی کے مظاہرے میں پھول نچھاور کررہے تھے۔

راجہ رگھو راؤ نے اپنے محل کو بیرونی بڑا حصہ باباصاحبؒ کے قیام کے لئے مخصوص کر دیااور اب فیض کا چشمہ پاگل خانے کی بجائے شکر درا کے محل سے بھاری وہ گیا۔ دن رات حضور باباصاحبؒ کے اطراف لوگ موجود رہتے۔ بابا صاحبؒ اپنے مخصوص انداز میں ان سے مخاطب ہوتے اور سُکر وصحو کی ملی جلی کیفیت میں جواب دیتے جنہیں متعلقہ افراد فوراً سمجھ جاتے۔ اکثر ایساہوتا کہ باباصاحبؒ کوئی ذکر فرماتے یا کسی کانام لیتے اور اس کے متعلق کچھ کہتے اور کچھ دیر بعد وہ شخص حاضر ہوتااور بالکل وہی باتیں کرتا جس کاانکشاف باباصاحبؒ پہلے ہی کر چکے ہوتے تھے۔

واکی میں قیام:

کچھ عرصہ شکر درا میں راجہ رگھوجی کے پاس رہ کر باباتاج الدینؒ واکی چلے گئے۔ یہاں آپ کاشی ناتھ پٹیل کے پاس ٹھہرے۔ کاشی ناتھ نے باباصاحب کی خدمت

میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ باباصاحب کو بے آرامی نہ ہو۔اب لوگوں کارخ واکی کی طرف ہوگیا۔ جہاں بابا صاحب بیشتر وقت میدانوں اور جنگلوں میں گزارتے تھے۔ باباصاحب لمباکُرتا پہنے، ننگے پیر گھومتے رہتے اور لوگ ساتھ ساتھ چل کر عرض پیش کرتے۔

واکی میں باباصاحب کی قیام گاہ سے دوفرلانگ کے فاصلے پر آم کاایک درخت تھا۔ باباصاحبؒ اس مقام کو شفاخانہ کہتے تھے۔مایوس العلاج مریض وہاں اگر ٹھہرتے تھے۔باباصاحبؒ خود بھی آنے والے مریضوں کوشفاخانے میں رکنے کاحکم دیتے تھے۔

شفاخانے کے قریب ایک جگہ کو باباصاحبؒ نے مدرسہ قرار دیاتھا۔جو طالبِ علم دعایا فہم وفراست میں اضافہ کے لئے دربارِ تاج الاولیاء میں حاضر ہوتے، باباصاحبؒ انہیں مدرسہ میں قیام کاحکم دیتے۔آج بھی لوگ حافظہ کی صلاحیت اور دماغ کی تیزی کے لئے مدرسہ میں ٹھہرتے ہیں۔باباصاحب نے اپنی جائے قیام کے پاس ایک جگہ کو مسجد کانام دیاتھا۔ بابا صاحبؒ جہاں بھی گئے ایک نہ ایک مقام کو مسجد ضرور قراردیا۔ منتشر الخیال اور شکوک دوسوسوں میں گرفتار افراد کا باباصاحب "مسجد" میں نماز کا حکم دیتے تھے۔

شکردرہ کوواپسی:

واکی کے دورانِ قیام بھی راجہ رگھو جی پابندی سے بابا صاحب کی خدمت میں آتے تھے اوران کی خدمت کو اپنے لئے سب سے بڑاسرمایہ سمجھتے تھے۔راجہ صاحب کااخلاص اوران کی نیاز مندی ایک بار پھر باباتاج الدینؒ کوشکردرہ کھینچ لے گئی۔

شکر درہ میں باباصاحب راجہ رگھو جی کے محل میں ٹھہرے۔ راجہ کا محل ناگپور اسٹیشن سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مرکزی سڑک سے ایک چھوٹی سڑک راجہ کے محل کو جاتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں کنارے جھونپڑیوں میں بابا صاحب کے خدمت گزار اور فیض یافتگان رہتے تھے جنہیں عرفِ عام میں بابا صاحب کے بچے کہاجاتاہے۔ یہ باباصاحب کی شخصیت تھی جس نے شکر درہ کو ایک شہر کی مانند بنادیا تھااور یہاں ہر وقت لوگوں کا میلہ سالگارہتا تھا۔

معمولات:

باباتاج الدینؒ وقت اور معمول کے پابند نہ تھے۔ وا کی کا زمانۂ قیام ہو یاشکر درہ کا دورِ سکونت۔ لوگ دیکھتے کہ باباصاحب ابھی ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں تو کچھ دیر بعد جنگل میں کسی درخت کے نیچے تشریف فرماہیں۔

شکر درہ میں صبح چار بجے باباصاحب کی خدمت میں چائے پیش کی جاتی اور اس وقت سے لوگ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ باباصاحب کبھی چائے پی لیتے۔ کبھی کسی کو دے دیتے۔ کبھی کچھ پی کر باقی حاضرین کو عنایت کر دی جاتی۔ دن نکلنے کے بعد بابا صاحب اکثر محل سے باہر نکلتے۔ شکر درہ محل کے باہر دکان دار، راجا کے نوکر اور زائرین اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے لیکن ان کی منتظر نظریں وقفے وقفے سے محل کے دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور جوں ہی باباصاحب محل سے باہر آتے، ایک شور بلند ہوتا کہ باباصاحب آرہے ہیں۔ مٹھائی والے مٹھائی لیکر دوڑتے، پھول والے گجرے اٹھاکر بھاگتے اور زائرین بابا کے پیچھے پیچھے چل پڑتے۔ محبین پھول نچھاور کرتے رہتے۔ کوئی بڑھ کر گجرا گلے میں ڈال دیتا۔ باباصاحب چلتے چلتے کسی مقام پر بیٹھ بھی

جاتے۔ لوگ پھول اور مٹھائی پیش کرتے، کوئی نذر پیش کرتا۔ باباصاحب بڑبڑاتے ہوئے سائلین کو جواب دیتے رہتے۔ ہجوم کی وجہ سے باباصاحب کا شفقت بھرا لہجہ کبھی کبھی پیار بھری ڈانٹ میں تبدیل ہو جاتا۔ خفا ہو کر مار بھی دیتے لیکن فدائین پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔

باباصاحب کبھی شہر کی طرف جاتے اور کبھی جنگل کا رخ کرتے۔ جنگل کی طرف پیدل بھی چل دیتے لیکن اکثر سواری پر جاتے تھے۔ سواری کے لئے بیل گاڑی یا تانگہ ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن زیادہ تر تانگے میں سفر کرتے تھے۔ باباصاحب محل سے نکل کر جب دور تک پیدل چلے جاتے تو لوگ کوشش کرتے کہ کسی طرح باباصاحب تانگہ میں سوار ہو جائیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ باباصاحب خود سواری طلب کرتے۔ ہیرالعل نامی کوچوان تانگہ حاضر کرتا۔ تانگے کے گھوڑے کا نام باباصاحب نے بہادر رکھا تھا۔ باباصاحب تانگے میں سوار ہو جاتے تھے۔ بہادر گھوڑا باباصاحب کے اشارے کا منتظر رہتا تھا۔

جوں ہی باباصاحب کی زبان سے نکلتا "بڑھاؤ" گھوڑا خود ہی سرپٹ دوڑنے لگتا۔ کوچوان کو باگیں کھینچنے اور دائیں یا بائیں اشارہ دینے کی اجازت نہ تھی۔ بہادر از خود سڑکوں اور جنگلوں کے راستوں پر دوڑتا رہتا۔ جیسے ہی تانگہ شکردرہ سے نکلتا، زیارت وقدم بوسی کے لئے لوگوں کو ہجوم ہو جاتا۔ اور ہجوم کے اکثر لوگ تانگے کے ساتھ دوڑتے رہتے۔ باباصاحب شہر کا گشت کرتے ۔ کسی کسی جگہ گاڑی رکوا کر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ ہر جگہ رکنے میں کوئی رمز پوشیدہ ہوتا تھا۔ اکثر دور سے آئے ہوئے لوگ جو باباصاحب سے ملاقات کی متمنی ہوتے تھے اور ملاقات کا موقع حاصل نہیں ہو پاتا تھا، باباصاحب ان سے ملتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کہیں رک کر مصیبت زدوں اور پریشان حالوں کو تسلی دیتے۔

باباصاحب پیدل جنگل کا رخ کرتے تو لوگ کھانا اور چائے لے کر ساتھ جاتے۔ باباصاحب اکثر دوپہر کا کھانا جنگل میں کھاتے تھے۔ کبھی خود طلب کرتے اور کبھی وقت ہونے پر لوگ پیش کرتے۔ ہر شخص اپنا توشے دان کھول کر باباصاحب کے سامنے پیش کرتا۔ باباصاحب کسی توشے میں سے کچھ کھا لیتے اور باقی کھانا زائرین میں تقسیم ہو جاتا۔ باباصاحب دال چاول شوق سے کھاتے تھے اور کبھی کبھی یہ شعر پڑھتے۔

دال چاول ہے پیڑ کا پھول   یہ نہ کھایا تو مٹی دھول

جنگل میں کئی کئی دن قیام رہتا۔ کبھی کسی گاؤں میں چلے جاتے اور کبھی گاؤں سے باہر ہی رہتے۔ لوگ جنگل میں بھی باباصاحب کے ساتھ مقیم رہتے۔ دربار تاج الاولیاء کے آداب میں یہ بات شامل تھی کہ کوئی بغیر اجازت واپس نہیں جاتا تھا۔ بعض لوگوں کو ملاقات کے بعد ہی جانے کی اجازت مل جاتی اور بعض ہفتوں وہاں رہتے۔ حاضرین دربار موسم کی سختیاں اور مسافرت کے دن برداشت کرتے لیکن جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔

اندازِ گفتگو:

باباتاج الدینؒ کا لب ولہجہ مخصوص تھا۔ آپ مدراسی لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ اردو بولنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ سوچ کر بولنا پڑتا تھا۔ پھر بھی الفاظ میں کچھ ایسا زور ہوتا تھا کہ سامعین ان کا سافی الضمیر فوراً سمجھ جاتے تھے۔ بات مختصر اور پر معنی ہوتی تھی۔ کبھی مثال زبان میں بات کرتے تھے، جس کا مطلب ایک ذہین شخص فوراً نکال سکتا تھا۔ اکثر قرآنی آیات کو گفتگو میں اس طرح استعمال کرتے تھے کہ سائل کے مسئلے کا حل اس میں موجود ہوتا تھا۔

صرف خصوصی مسائل ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی باباصاحبؒ اپنی گفتگو کے اندر ایسے مرکزی نقطے بیان کر جاتے تھے جو براہِ راست قانونِ قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہیں۔ بعض دفعہ اشاروں ہی اشاروں میں وہ ایسی بات کہہ جاتے تھے جس میں کرامتوں کی علمی توجیہ ہوتی اور سننے والے کی آنکھوں کے سامنے یکبار گی کرامت کے اصولوں کا نقشہ آجاتا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے ذہن سے تسلسل کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں روشنی کی لہریں منتقل ہو رہی ہیں اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرین ہر وہ بات من و عن اپنے ذہن میں سمجھتے اور محسوس کرتے جارہے ہیں۔ جو باباصاحب کے ذہن میں اس وقت گشت کر رہی ہے۔ باباصاحب چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، گاہے بہ گاہے کچھ بول دیتے۔ عام آدمی ان جملوں کو بے ربطہ بات سمجھ کر قابلِ توجہ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اس میں کسی کے مسئلے کا حل، سوال کا جواب یا کسی نکتہ کی وضاحت پوشیدہ ہوتی تھی۔

رحمت وشفقت:

اگر باباتاج الدینؒ کی مصروفیات کو چند الفاظ میں سمیٹا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ کا ہر لمحہ مخلوقِ خدا کے لئے وقف تھا۔ آپ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں آرام کر پاتے تھے۔ باقی وقت لوگوں کی غرض سنتے یہاں تک کہ کھانے پینے کے اوقات بھی نظرانداز ہو جاتے۔ رات دن حاجت مند اور پریشان حال آتے رہتے۔ باباصاحب اپنے مخصوص انداز میں انہیں تسلی دیتے اور مشکل کے حل کی طرف اشارہ فرماتے۔ باباصاحب کی ہستی لوگوں کے لئے لطف و محبت اور کرم نوازی کا ایسا ذریعہ تھی جس کے آگے انہیں ہر تکلف اور صعوبت ہیچ محسوس ہوتی تھی۔ باباصاحب ڈھارس بندھاتے تو انہیں ایسا اطمینان مل

جاتاجو کسی مادّی ذریعہ سے ملنا ممکن نہیں۔دل کے بوجھ یوں دور ہو جاتے جیسے کسی انجانے ہاتھ نے غم کے پہاڑ سینے پر سے ہٹا دیئے ہوں۔آخری زمانے میں جب باباصاحب کی صحت گر گئی تھی اور کمزوری کی وجہ سے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔اس وقت بھی لوگوں کے معاملات سننے اور جواب دینے میں دلچسپی لیتے رہے۔حالتِ جلال ہو یا جمال کبھی کسی کو باباصاحب کی ذات سے تکلیف نہیں پہنچی۔بارہا دیکھا گیا کہ لوگ رنجیدہ آئے اور خوش و خرم واپس گئے۔باباصاحب بعض اوقات ہجوم میں گھر جاتے تو بلند آواز سے فرماتے "تم سب جاؤ۔تمہارے کام ہو گئے۔"لوگ مطمئن واپس جاتے اور اللہ تعالیٰ ان کے کام بنا دیتا۔

باباصاحب کے پاس زمانے کے ستائے ہوئے بھی آتے،حالات کے مارے بھی آپ کے در کا رخ کرتے،خطاکار بھی احساسِ گناہ لے کر حاضر ہوتے۔ایسے لوگ بھی درِ تاجِ اولیاء میں آتے جو امارت کے باوجود پریشان حال ہوتے اور ایسے بھی فریاد کناں ہوتے جن پر غربت ایک بوجھ بن گئی ہوتی۔باباصاحب بلا امتیاز امیر و غریب،خطاکار و پاک باز، سب کی غرض و فریاد سنتے۔ایک بار ایک طوائف باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور گا کر کہا۔

اچھے رہیں نزدیک برے جائیں کدھر کو
اے رحمتِ خدا! تجھے ایسا نہ چاہیئے

یہ سن کر باباصاحبؒ نے اس سے کہا۔

اچھے اُدھر کو جائیں،آئیں برے اِدھر کو
اے رحمتِ خدا،تجھے ایسا ہی چاہیئے۔

ایک لڑکا پیدائشی معذور تھا۔ نہ بول سکتا تھا اور نہ ہاتھ پیر ہلا سکتا تھا۔ والدین نے حتی المقدور علاج کرایا لیکن فائدہ نہ ہوا۔ وہ لڑکے کو شکردرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد باباصاحب اندر سے باہر تشریف لائے اور معذور لڑکے کے پاس پہنچ کر کھانا طلب کیا۔ لوگوں نے فوراً کھانا پیش کیا۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے اسے آدھے گھنٹے تک لقمہ لقمہ کرکے کھانا کھلایا، اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا اور ایک آدمی اس کی خدمت کے لئے مقرر کر دیا۔ باباصاحب کے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ دربار میں حاضر ہونے والے لوگ اس لڑکے کی خدمت اپنے لئے باعثِ عزت سمجھنے لگے اور وہ لڑکا جب تک زندہ رہا کبھی کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہوا۔

ایک دفعہ باباتاج الدینؒ قصبہ پاٹن ساؤنگی کی گلیوں سے گزر رہے تھے اور جلوس کے ساتھ سینکڑوں لوگ موجود تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں ایک بوڑھا اور بوڑھیا جوار پیس رہے ہیں۔ مگر ضعف و ناتوانی کی بنا پر چکی چلانے میں دقّت ہو رہی ہے۔ باباصاحب تانگے سے اتر کر مکان میں گئے اور خود آٹا پیسنے لگے۔ تھوڑی دیر میں تمام جوار پیس کر آٹا ان کے حوالے کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ایک رات باباصاحب کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا۔ توانہوں نے فرمایا: "پہلے ہمارے مہمان کو کھلاؤ جو درخت کے نیچے ٹھہرا ہوا ہے۔ تب میں کھاؤں گا۔" لوگوں نے کئی جگہ دیکھا مگر کسی ایسے شخص کو پانے میں ناکام رہے جس پر باباصاحب کے الفاظ صادق آتے ہوں۔ باباصاحب سے دوبارہ کھانے کی درخواست کی گئی تو وہی جواب ملا کہ پہلے ہمارے مہمان کو کھلا کر آؤ۔ لوگ ایک دفعہ پھر تلاش کو نکلے۔ ایک درخت کے نیچے کوئی صاحب بیٹھے نظر آئے۔ لوگوں نے ان کا حال پوچھا تو پتہ چلا کہ کسی دور دراز جگہ سے مفلسی کے عالم میں آئے ہیں اور باباصاحب سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ یہ سن

کر لوگوں نے کہا کہ باباصاحب نے آپ کے لئے کھانا بھیجا ہے۔ایک بار باباصاحب گھومتے ہوئے ڈگوری کی طرف گئے۔عبداللہ دکھنی نامی شخص کا یہ ذمہ تھاجب باباصاحب ڈگوری کی طرف جاتے وہ ساتھ جانے والے لوگوں کو پانی پلاتے۔چنانچہ اس دن بھی پانی کا گھڑا ساتھ لئے ہوئے ڈگوری پہنچے۔وہاں پہنچ کر باباصاحب کو پانی پیش کیاتو انہوں نے پانی پینے سے انکار کر دیا۔کہا"گھوڑے کو پلا کر آ،تب پیوں گا۔"قریب ایک فرلانگ دور گھوڑا کھڑا تھا۔عبداللہ دکھنی پانی لے کر گھوڑے کے پاس پہنچے۔گھوڑااتناپیاسہ تھا کہ پانچ برتن پانی پی گیا۔مندرجہ بالا واقعات کے علاوہ سینکڑوں واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ باباصاحبؒ کی ذات مخلوقِ خدا کے لئے مجسم شفقت اور محبت تھی اور آپ نے خود کو خدمتِ خلق کے لئے وقف کرر کھاتھا۔

تعلیم و تلقین:

باباصاحب دو بنیادی باتوں پر زور دیتے تھے۔ایک اللہ تعالیٰ سے تعلق اور دوسرا اخلاصِ عمل۔باباصاحب کو مردم آزاری اور ظلم سخت ناپسند تھے۔باباصاحبؒ کہتے تھے۔"اللہ اللہ کرتے،اچھے رہتے۔"اللہ تعالیٰ سے رابطہ دین کی روح ہے۔اور صلوٰۃ ہو یا ذکرِالٰہی سب اسی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔باباصاحبؒ کا منشاء یہ تھا کہ اللہ سے تعلق خاطر ویسے ہونا چاہئے جو ایک بندے اور خالق کے درمیان ضروری ہے۔حاضرینِ دربار کے فکر و عمل کی خامی کو باباصاحبؒ نہایت لطیف پیرائے میں ظاہر کرتے تھے،اس طرح کہ وہ سمجھ بھی جائیں اوران کی پردہ پوشی بھی رہے۔کسی بات کی تلقین فرماتے تو اکثر تمثیلی زبان استعمال کرتے۔

خدائے رام نامی ایک سود خور واکی میں باباصاحب کے پاس آیا۔ تو باباصاحب نے ایک لکڑی اٹھائی اور مارتے ہوئے کہا۔ "بڑا ظالم ہے، مخلوق کو ستاتا۔" پھر فرمایا۔ "سود لینا چھوڑ دے۔" خدائے رام پر ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر وہ باباصاحب کے پاس رہا اور سودی کاروبار چھوڑ دیا۔ ایک پیر صاحب باباکے پاس آئے اور عرض کیا کہ حضور! دعا فرمائیں کہ مجھے روحانیت میں ترقی نصیب ہو۔

باباصاحب نے کہا۔ "کتّا مار کر لاؤ، ہم دونوں کھائیں گے۔"

باباصاحبؒ کا اشارہ اس حدیث کی طرف تھا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتّے ہیں۔ مولانا یوسف شاہ صاحب کی ایک درویش سے راہ ورسم پیدا ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ تعلقات دوستی میں بدل گئے۔ وہ درویش کیمیا جانتے تھے۔ انہوں نے مولانا کو ترکیب بتادی۔ مولانا صاحب نے سوچا اگر باباصاحب اجازت دے دیں تو بلا محنت ومشقت کے بہت اچھا ذریعۂ آمدنی ہو جائے گا۔ باباصاحب کے پاس پہنچے تو باباصاحب نے فرمایا۔ "غلاظت کھانا چاہتے ہو؟" مولانا فوراً سنبھل گئے۔

ایک صاحب کو یہ زعم تھا کہ باباصاحب سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لئے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ باباصاحب نے ان سے کہا۔ "ہم سے کم کسی کو نہیں سمجھتے۔" اکثر طوائفیں بھی حاضر ہوتی تھیں۔ لوگوں کو یہ بات عجیب دکھائی دیتی تھی لیکن باخبر لوگوں کو پتہ تھا کہ شاید ہی کوئی طوائف ہو جس کی حالت دربار میں حاضر ہونے کے بعد بدل نہ گئی ہو۔ طوائفوں کو مختلف پیرائے میں حکم دیتے تھے۔ مثلاً فرماتے تھے۔ "اماں، سواری کے لئے ایک گھوڑا پسند کر لو۔"

ایک دفعہ باباتاج الدینؒ کے چند نام لیوا شکردرہ میں باباصاحبؒ کی جائے قیام سے کچھ فاصلے پر بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا، میں تم سب لوگوں پر

فوقیت رکھتاہوں ، اس لئے کہ میں ساری جائداد چھوڑ کر بابا صاحب کی خدمت میں آیاہوں۔ دوسرے نے کہا، میری قربانی تم سے کم نہیں ہے۔ میں تو پوری دوکان چھوڑ کر حاضر ہواہوں۔ غرض ہر شخص اپنی بڑائی جتارہاتھا۔ اسی لمحہ باباصاحب محل سے باہر نکل کران لوگوں کے پاس آئےاور یہ قرآنی آیت پڑھی:

ترجمہ: لوگ اسلام لانے کا آپ پر احسان دھرتے ہیں۔ کہہ دواے نبیؐ! تم اپنے اسلام لانے کااحسان مجھ پر نہ رکھو۔ یہ تواللہ کااحسان ہے تم پر کہ تم کوایمان کو طرف رہنمائی فرمائی۔(پ٢٦،ع١٤)

مختصر یہ کہ جلالی وجمالی کیفیت میں اشاروں، کنایوں اور تمثیلی اندازِ بیان کے ذریعے حاضرین کو تلقین جاری رہتی اور بنیادی نکتہ یہی ہوتا کہ لوگ حرص وہوس سے آزاد ہو جائیں۔ اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ کبھی کبھی تیز وتند لہجہ بھی اختیار کر لیتے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ باباآپ لوگوں کو سخت وسست کیوں کہتے ہیں؟جواباًفرمایا۔ "نہیں رے، میں توانہیں دعادیتاہوں۔"

کشف و کرامات

انبیاء اور رسولوں سے معجزات کا ظہور ہوا اور ختمِ نبوت و رسالت کے بعد یہ وراثت اولیاء اللہ کو منتقل ہوئی۔ علمِ نبوت کے زیرِ سایہ جو خرقِ عادت اولیائے کرام سے صادر ہوئی وہ کرامت کہلائی۔ ان پاک طینت حضرات سے کرامات کا اظہار بطور رُشد وہدایت اور تعلیم و تنبیہ کے ہوا۔

بابا تاج الدینؒ ناگپوری کی ذات بابرکات کشف و کرامات کے ضمن میں ممتاز و منفرد ہے۔ باباصاحبؒ کا ذہن فطرت کی قوتوں میں اس قدر جذب تھا کہ آپ سے خرقِ عادت بطور عادت سرزد ہوتی تھی۔ باباصاحبؒ کی ذات میں یہ عجیب خوبی بھی دیکھی گئی کہ ان سے کشف و کرامت کا اظہار غیر ارادی طور پر ہو جاتا تھا۔ ارادہ یا ذہنی کی قوت استعمال کرکے تصرّف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

باباصاحبؒ کا یہی طرز ذہن تھا جس کی وجہ سے ان کے کشف و کرامات کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا جائے تو کشف و کرامات کا باب ہی ایک الگ کتاب بن جائے گا۔ باباصاحبؒ کی گفتگو ان کے اٹھتے بیٹھتے، معمولات و مصروفیات سب میں کرامت کے پہلو موجود ہیں۔ اسی بات کے پیشِ نظر کشف و کرامات کے باب میں باباصاحب کی منتخب کرامات، کشف اور تصرفات کو شامل کیا گیا ہے۔

اب تک باباتاج الدینؒ سے متعلق جتنے تذکرے شائع ہوئے ہیں ان میں قلندر باباولیاءؒ کی تصنیف "تذکرہ تاج الدینؒ" کے علاوہ کسی تذکرے میں اس طرزِ فکر یا ان قوانین کو سامنے نہیں لایا گیا ہے۔ جن کے تحت کرامات صادر ہوتی ہیں۔ "تذکرہ تاج الدین بابا" میں جو کرامات بیان کی گئی ہیں ان کو فیض یافتگان کے باب میں قلندر باباولیاءؒ کے تذکرے کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ "تذکرہ تاج الدین بابا" کی طرز کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے باباتاج الدینؒ کی بعض کرامات و تصرفات کے ساتھ ان قوانین کو بھی بیان کیا ہے جن کی بنیاد پر کسی کرامت کا صدور ہوتا ہے۔

باباتاج الدینؒ کے تذکرے اور کرامات پر مبنی ایک کتاب "تاج قطبی" باباصاحب کے زمانۂ حیات میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مصنف قطب الدین صاحب تھے۔ اور سن اشاعت ۱۹۱۱ء تھا۔ ہم کرامات کا بیان "تاج قطبی" کی منتخب کرامات سے شروع کرتے ہیں۔

آگ:

باباحضور پاگل خانہ جانے سے پہلے چار سال کامٹی میں مقیم رہے۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے اور یہ ہی پہلا کرشمۂ ولایت ہے۔ ایک رات آپ ایک زر گر کے مکان میں داخل ہوئے اور اس سے ارشاد فرمایا: "فوراً مکان سے سامان نکال اور یہاں سے نکل جا۔"

اس نے سوچا کہ یہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں نے ان کے حکم کی تعمیل نہ کی تو شاید کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ چنانچہ اس نے گھر سے سامان نکال لیا اور مکینوں کو بھی باہر کر دیا اور پھر اس مکان میں آگ بھڑک اٹھی۔ اور مکان جل گیا۔

مقدمہ:

ایک روز آپ کامٹی میں حضرت سید صاحب کے مزار کے قریب ٹہل رہے تھے۔ایک مارواڑی پر کسی نے مقدمہ دائر کرر کھا تھا۔وہ اس کی پیروی کے لئے کچہری جا رہا تھااور پریشان حال تھا۔ آپ اسے دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنسے اور فرمایا۔"نالش تو خارج ہوگئی۔"

اس نے سوچا کچہری جاکر دیکھنا چاہئے۔ جاکر دیکھا تو مقدمہ واقعی خارج ہو چکا تھا۔ وہ صدق دل سے شیرینی لیکر حاضرِ خدمت ہوا۔ آپ نے حکم دیا۔"ہم کو کیا دیتاہے،بچوں کو تقسیم کردے۔"

کامٹی میں اس قسم کے بہت سے واقعات ظہور میں آئے۔اس کے بعد پاگل خانے میں آپ کی تشریف آوری ہوئی جہاں ایسے بہت سے واقعات ظہور میں آئے۔

طمانچے:

ایک روزایک پاگل جب دوسرے پاگلوں کے ساتھ کام پر پاگل خانے سے باہر گیاتو محافظ کی نظروں سے بچ کر فرار ہوگیا۔اوراپنے گھر کی طرف نکل گیا۔شام کو گنتی کے وقت جب وہ پاگل خانے میں نظر نہ آیاتواس کی تلاش شروع ہوئی۔ڈاکٹر عبدالمجید خاں صاحب مرحوم بہت پریشان ہوئے اور ماتحت ملازمین پر خفا ہونے لگے۔ اسی دوران باباحضور تشریف لائےاور فرمایا۔"کیوں گھبراتے ہو،وہ کل خود چلاآئے گا۔"

چنانچہ دوسرے دن وہ پاگل از خود گیٹ پر موجود تھا۔ پاگل خانے کے ملازمین نے اسے اندر بلایالیا۔اور ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی۔انہوں نے آکر اس سے پوچھا کہ تو کہاں چلا گیا تھا۔ تواس نے اپنی زبان میں جواب دیا کہ اپنے گاؤں گیا تھا۔ پھر یہی پوچھا گیاتو

اسنے دوبارہ یہی جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ تو واپس کیسے آگیا تو اس نے جواب دیا۔ "بھائی تاج الدین نے مجھے دو طمانچے مارے اور کہا، کہاں جاتا ہے، چل پاگل خانے اور مجھے کھینچ کر لے آئے۔"

پتہ اور انجن:

ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب نے ایک تقریب میں شرکت کے لئے بمبئی جانے کا ارادہ کیا۔ اور حضرت باباجان تاج الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ "مت جاؤ! راستہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔"

جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے درخت سے پتہ توڑ کر دیا اور فرمایا کہ اس کو ساتھ لے کر جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بمبئی روانہ ہوئے۔ راستے میں ایسا خطرناک واقعہ پیش آیا کہ ان کی جان بچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر صاحب کسی ضرورت کی وجہ سے بھساول ریلوے اسٹیشن پر اُترے۔ وہ ریلوے لائن پار کر رہے تھے کہ اچانک ریلوے انجن ان کے بالکل قریب آگیا۔ اور اس کی دہشت سے وہ ریلوے لائن پر ہی گر پڑے۔ حالانکہ انجن پورے رفتار سے آرہا تھا۔ لیکن جونہی ان کے نزدیک آیا، رک گیا۔ ریلوے کے ملازمین نے آپ کو لائن پر سے اٹھایا اور کہا۔ "کیا آپ کوئی عامل ہیں، انجن روکے بغیر خودبخود کیسے رک گیا؟"

اس پر ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کو بابا حضورؒ کی جانب سے روانگی کی ممانعت اور پھر درخت کے پتے کا پورا واقعہ سنایا۔

سول سرجن:

ایک اور پاگل خانے میں حکام کی ماہانہ میٹنگ تھی۔ سول سرجن کی نشست کے برابر ایک کرسی خالی تھی۔ باباحضور نے اس کو دیکھ کر ڈاکٹر عبدالحمید خاں صاحب سے کہا۔ "تم کیوں کھڑے ہو، اس پر بیٹھ جاؤ۔ تم بھی وہاں بیٹھ سکتے ہو۔" آپ نے یہ بات دو تین بار کہی۔

جب میٹنگ ختم ہوئی تو سرجن جنرل نے ڈاکٹر صاحب کو بلایا اور کہا۔ "ہم تم کو اسسٹنٹ سرجن مقرر کرنا چاہتے ہیں۔"

قریب المرگ لڑکی:

ایک شخص جسکی بیٹی بہت بیمار بلکہ قریب المرگ تھی باباحضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور شفا کیلئے دعا کی درخواست کی۔ اس کی گزارش سننے کے بعد آپ چند لمحے خاموش رہے اور پھر کچھ دیر آنکھیں بند کرنے کے بعد ہنس کر فرمایا۔ "جا بابا، لڑکی تو اچھی ہو گئی۔" وہ شخص بہت خوش ہوا اور بے قراری سے پوچھا کہ بچی یک بیک کیسے صحت یاب ہو گئی؟ انہوں نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک سائل دروازے پر آیا۔ جب اس کو خیرات دی گئی تو اس نے ہماری غم زدہ حالت دیکھ کر خود پوچھا کہ تمہارے گھر میں کیا پریشانی ہے۔ ہم نے کہا کہ کیا بتائیں، ہماری بچی کوئی دم کی مہمان ہے۔ سائل نے کہا چلو ہم دیکھیں گے۔ ہم انہیں گھر میں لے آئے۔ تھوڑی دیر وہ بیمار کے قریب کھڑے رہے اور پھر فرمایا "اچھی ہو جائے گی غم نہ کرو۔" ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد بچی میں ہوش میں آگئی اور کھانے کو مانگا۔

اجنبی بیرسٹر:

منشی اصغر علی صاحب ناگپوری جو سیوئنگ مشین کمپنی میں ملازم ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے جناب دیدار بخش، پاسٹ ماسٹر ناگپور پور پوسٹ آفس کی زبانی سنا ہے کہ بابورام سنگھ نامی ایک سرکاری ملازم تھے۔ ان کے خلاف کوئی سرکاری جرم عائد ہوا اور مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ انہوں نے بری ہونے کی ہر تدبیر کی اور جب مایوس ہو گئے تو حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر گریہ وزاری کی۔ آپ نے فرمایا "چلا جا، کیا ہوتا ہے، بری ہو جائے گا۔" یہ سن کر وہ شخص خوشی خوشی واپس آ گیا۔ مقررہ تاریخ کو عدالت میں حاضر ہوا اور طلبی پر عدالت میں پیش ہوا۔ فریقِ مخالف کی طرف سے وکیل بھی موجود تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اجنبی بیرسٹر عدالت میں آئے اور کہا "میں بیرسٹر ہوں اور فلاں شہر میں رہتا ہوں۔" انہوں نے کوئی دور دراز شہر کا نام بتایا اور کہا کہ میں رام سنگھ کی طرف سے اس کے مقدمے کی پیروی کروں گا۔

مقدمے کی کاروائی شروع ہوئی۔ بحث کے دوران بیرسٹر صاحب نے کوئی قانونی نکتہ اٹھایا جس کا فریقِ مخالف کوئی جواب نہ دے سکا اور معذرت کے ساتھ بیرسٹر صاحب کی بحث اور اعتراض کو معقول قرار دیا۔ اس پر بیرسٹر صاحب نے کہا کہ گزشتہ تمام کاروائی بے ضابطہ تھی اور مقدمے کی روئداد سے ملزم قطعی بے گناہ ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا ملزم کو آج ہی کیوں نہ بری کیا جائے؟

عدالت نے بیرسٹر صاحب کی تجویز منظور کی اور ملزم کو اسی وقت بری کر کے مقدمہ خارج کر دیا۔ بیرسٹر صاحب عدالت سے روانہ ہوئے تو رام سنگھ بھی آہستہ آہستہ ان کے پیچھے چلا۔ تھوڑی دور جا کر رام سنگھ نے بیرسٹر صاحب کے سامنے آ کر عرض کیا۔

"سرکار! یہ نکتہ میری سمجھ نہیں آتا کہ آپ میرے بلائے بغیر اس مقدمے کی پیروی کے لئے کیسے آ گئے؟"

بیرسٹر صاحب نے فرمایا"تجھے کیا ضرورت ہے۔ آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟ جس سے تو نے مقدمے میں مدد طلب کی ہے، اسی نے مجھے پیروی کے لئے بھیجا ہے۔ اب تو اپنے گھر جا، ہم اپنے گھر جاتے ہیں۔"

دنیا سے رخصتی:

ایک روز میں (مصنّف) نے کامٹی میں ارادہ کیا کہ پاگل خانے جا کر درخواست کروں کہ میرے فرزند فخر الدین کے لئے شفا کی دعا فرمائیں جو چار مہینے سے سخت بیمار تھا۔ تقریباً بارہ بجے پاگل خانے میں داخل ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ "کس لئے دعا کریں۔ وہ تو دنیا سے رخصت ہو گیا۔" اور پھر وہ الفاظ آپ نے فرمایا جو گزشتہ شب میرے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ میں انگشت بدنداں رہ گیا کہ وہ الفاظ جو میں نے اپنے دل میں رکھے تھے، بابا حضور نے یک بیک کیسے کہہ دیئے۔ مجھے صبر کی تلقین فرمائی۔ جب میں وہاں سے لوٹا تو راستے میں ایک شخص نے بتایا کہ گیارہ بجے بچے کا انتقال ہو گیا۔ میں نے گھر جا کر میت کی تجہیز و تکفین کی۔

جبلِ عرفات:

میرے ایک معتمد اور متقی دوست عبدالرحمٰن ساکن ایڈیٹر ذکر کرتے ہیں کہ ایک بزرگ شخص حجِ بیت اللہ کے لئے گئے۔ انہوں نے باباحضور کو جبلِ عرفات پر دیکھا اور اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی صاحبِ اختیار بزرگ ہیں۔ انہوں نے باباصاحب سے ملاقات کی اور ان کا نام اور پتہ دریافت کیا۔ فرمایا میں ناگپور کی پاگل

جھونپڑی میں رہتاہوں۔ اور نام تاج الدین ہے ۔ اتنا فرما کر آپ وہاں سے چل دیئے۔ اور پھر ان کو نہ ملے ۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد وہ صاحب جب اپنے وطن ہندوستان آنے لگے تو انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ گھر واپس پہنچنے سے پہلے ناگپور جاکر ان بزرگ کا دیدار کریں گے جو جبلِ عرفات پر ملے تھے۔ چنانچہ وہ ناگپور آئے اور پاگل جھونپڑی کی تلا ش شروع کی۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں پاگل جھونپڑی تو کوئی نہیں البتہ ایک پاگل خانہ ضرور ہے۔ اور وہاں ایک بزرگ بھی ہیں جن کی تفصیل تم بتارہے ہو۔ وہ پاگل خانے آئے۔ باباحضور نے ایک گھنٹہ پہلے ہی ان صاحب کے آنے کی اطلاع پاگل خانے میں موجود لوگوں کو دے دی تھی۔ یہ صاحب پہنچے تو باباصاحب نہایت شفقت اور تپاک سے ملے اور ملاقات و گفتگو کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ گفتگو کے دوران ان صاحب کے دل میں اچانک یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ بزرگ تو بے شک صاحبِ منزل ہیں لیکن ان کا کوئی کشف یا کرامت دیکھنی چاہئے۔ جس وقت وہ یہ سوچ رہے تھے ، باباحضور کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، فوراً قریب آئے اور اپنے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو ان کی دونوں انکھوں پر رکھ کر ارشاد فرمایا۔ "کیا بابا! یہی جبلِ عرفات ہے جہاں آپ حج کو گئے تھے؟"

یہ سنتے ہی ان صاحب نے بند آنکھوں سے دیکھا کہ جبلِ عرفات پر کھڑے ہیں۔ وہی وقت ، وہی رونق، وہی مجمع ہے۔ انہوں نے کہا۔ "بے شک یہی جبلِ عرفات ہے۔ یہ تو آپ نے دکھادیا مگر مقامِ رب العالمین تو دکھایئے۔"

اس پر آپ نے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر سے ہٹالیا اور فرمایا۔ "اتنا دور کون جائے!"

بحالی کا حکم:

ایک شخص سرکاری ملازم تھا۔ برطرف ہو گیا۔ بہت اپیلیں کیں مگر بے سود۔ تب وہ اجمیر شریف گیا۔ اور وہاں چند روز قیام کیا۔ کچھ دنوں بعد اسے خواب میں خواجۂ خواجگاں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت نصیب ہوئی۔ دیکھا کہ عالی جاہ چند لوگوں کے ہمراہ کہیں تشریف لے جارہے ہیں۔ خواجہ غریب نوازؒ نے اس شخص کو طلب فرمایا اور پھر ارشاد ہوا "تو اپنی ملازمت پر بحال ہو گیا۔" یہ شخص واپس وطن روانہ ہوا۔ گھر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ ملازمت کی بحالی کا حکم آیا ہوا ہے۔ چند دنوں بعد یہ شخص بابا حضور تاج الدین کے دیدار کے لئے آیا۔ اسے دیکھتے ہی حضور نے فرمایا۔ "میاں کیوں آئے ہو۔ ہم کو پہچانتے ہو؟ ہم بھی تو وہاں حاضر تھے جب بڑے صاحب نے تمہاری بحالی کا حکم دیا تھا۔"

دیکھنے کی چیز:

منشی محمد حسین مرحوم نے جو تحصیلدار کہلاتے تھے اور جنہوں نے واکی ہی میں رحلت فرمائی۔ ایک روز عرض کیا کہ میں نے اپنے وطن حیدر آباد کئی خط روانہ کئے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ جس کی وجہ سے طبیعت بہت پریشان ہے۔ بابا حضور نے فرمایا "تمہارے خطوط کہاں ہیں؟" پھر پشت کی طرف ہاتھ ڈال کر تمام خطوط نکال کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور فرمایا "خطوط تو یہیں پڑے ہیں۔"

اسی طرح ایک روز جنگل میں بابا حضور نے تحصیلدار کو ایک درخت کے نیچے چادر بچھانے کا حکم دیا۔ پھر کچھ دیر بعد حکم دیا کہ چادر اٹھالے۔ انہوں نے دیکھا کہ چادر کے نیچے روپوں کا فرش بچھا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا۔ "یہ سب میں لے لوں؟"

آپ نے ارشاد فرمایا۔ "نہیں، یہ صرف دیکھنے کی چیز ہے، لینے کی نہیں"۔ پھر آپ نے فرمایا۔ "چادر ڈال دے۔"

انہوں نے چادر ڈال دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا۔ "چادر اٹھالے۔"

حسب الحکم چادر اٹھائی تو دیکھا کہ روپوں کے فرش کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

لمبی نکو کر ورے:

سردار خان صاحب کا ایک ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ اور اس میں خون کی روانی صحیح نہ رہی۔ اس زمانے میں باباصاحبؒ پاگل خانے میں جلوہ افروز تھے۔ اور ہر طرف آپ کی شہرت پھیل رہی تھی۔ سردار خان کو ان کے خسر ساتھ لے کر خانے پہنچے اور یہ دونوں نیم کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک حاجی صاحب آئے اور باباصاحب کو پوچھنے لگے۔ لوگوں نے حاجی صاحب کے آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میں حج کر کے آرہا ہوں۔ مکّہ میں تاج الدین نام کے ایک صاحب میرے ساتھ رہے اور انہوں نے مجھے اپنا پتہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ میں ناگپور کے پاگل خانے میں رہتا ہوں۔

حاجی صاحب کی یہ بات ڈاکٹر کاشی ناتھ راؤ نے بھی سنی جو پاگل خانے کے نگراں ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو پتہ تھا کہ باباصاحبؒ ۲۱ روز سے کمرے بند ہیں۔ اور جب بھی کمرہ کھولا جاتا تھا باباصاحب کمرے میں موجود ہوتے تھے۔ دو جگہ بیک وقت موجودگی کی شہادت ملنے سے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ پہلے ہی سے باباصاحبؒ کے عقیدت مند اور خدمت گزار تھے۔ یہ سن کر بے اختیار ان کی زبان سے باباصاحب کی شان اور عظمت میں کلمات جاری ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت بابا تاج الدینؒ اپنے کمرے سے باہر آئے اور ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ "لمبی نکو کر ورے، لمبی نکو

کر ورے۔(اس بات کو طول مت دو) یہ کہہ کر باباصاحبؒ سردار خان صاحب کی طرف مڑے اور اپنی انگلی پکڑ کر کہنے لگے۔ "بڑی جلن رے، بڑادرد رے۔" بابا صاحبؒ یہ الفاظ ادا کر رہے تھے اور سردار خان کو اپنے ہاتھ میں توانائی بحال ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ کئی بار یہ جملے ادا کرنے کے بعد باباصاحب نے جھٹکے سے اپنی انگلیاں چھوڑ دیں۔ سردار خاں نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ پوری طرح کام کر رہاہے۔ باباصاحب نے سردار خاں سے کہا۔ "حاجی سردار خاں جاکر آؤ۔" چنانچہ سردار خاں صاحب کو حج کی سعادت نصیب ہوئی جیسا کہ باباصاحبؒ نے اشارہ فرمایا تھا۔

بہت سے واقعات ایسے ہیں جن میں باباتاج الدینؒ بہ یک وقت ایک سے زیادہ جگہوں پر دیکھے گئے۔ ایک مرتبہ قلندر اولیاءؒ سے یہ بات پوچھی گئی کہ ایسا ہونا کیوں کر ممکن ہوتاہے تو آپ نے فرمایا۔ "اس کی بہت آسان مثال فوٹو ہے۔ فوٹو گرافی میں ایک نگیٹو پہلے بنایا جاتاہے اور پھر اس نگیٹو سے اس کا پوزیٹو حاصل کیا جاتاہے۔ نگیٹو سے ہم صرف ایک پوزیٹو تصویر نہیں بلکہ جتنی تصاویر چاہیں تیار کر سکتے ہیں۔ کم وبیش یہی حال روح کی تخلیقات کا ہے۔ روح ایک طرح کی نگیٹو ہے اور گوشت پوست کا جسم اس کا پوزیٹو۔ اگر کسی شخص کے ذہن کا لینس مصفّٰی اور طاقتور ہے تو وہ چاہے تو خود (یعنی اپنی روح کو) پوزیٹو تصاویر کی طرح بہ یک وقت کئی جگہ تشکّل کر سکتا ہے۔

اس کی دوسری مثال ٹیلی فون ہے۔ مرکزی اسٹیشن سے ایک ہی نشریات فضا میں بکھرتی ہیں اور بہ یک وقت ہزاروں لاکھوں جگہوں پر موجود ٹی وی سیٹوں کے پکچر ٹیوب اسے حاصل کرکے پوزیٹو میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایک ہی شکل، ایک ہی تصویر بہ یک وقت ہزاروں جگہ پر متحرک ہو جاتی ہے۔ اولیاء اللہ اور روحانی طاقت رکھنے والے

حضرات اسی اصول پر اپنی روح کی نشریات کو بہ یک وقت کئی اسکرینوں (مقامات) پر متحرک کر دیتے ہیں۔

غیبی ہاتھ:

ایک دن ڈاکٹر کا مٹی ناتھ راؤ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک بابا تاج الدینؒ اُن کے کمرے میں داخل ہوئے۔ باباصاحبؒ کے چہرے سے جلال برس رہا تھا۔ بابا صاحبؒ کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر ڈاکٹر صاحب گھبرا گئے۔ انہیں یاد آیا کہ باباصاحب کو تو ان کے کمرے میں باہر سے تالا لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ پھر آپ یہاں کیسے آگئے! ابھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ایک نامعلوم آواز گونجی "السلام علیکم"۔ باباصاحبؒ نے جواباً کہا "وعلیکم السلام"۔ ساتھ ہی دیوار سے ایک ہاتھ نمودار ہو کر باباصاحبؒ کی طرف بڑھا۔ باباصاحب نے مصافحہ کیا اور ہاتھ غائب ہو گیا۔ باباصاحبؒ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب دوڑتے ہوئے باباصاحبؒ کے کمرے تک پہنچے اور دروازہ کھول کر دیکھا تو باباصاحبؒ مراقبہ کی حالت میں بیٹھے تھے۔

اسی زمانے میں گیارہ پاگل بیک وقت پاگل خانے سے فراز ہو گئے۔ لیکن اگلے روز خود ہی آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب پاگلوں کے پاس کھڑے تھے کہ پاگل خانے کا انگریز افسر اعلیٰ آ گیا۔ ابھی ڈاکٹر کاشی ناتھ راؤ اور افسرِ اعلیٰ میں گفتگو ہو رہی تھی کہ باباتاج الدین وہاں آئے اور انگریز کو مخاطب کر کے کہا۔ "تو یہاں کیا کرتا ہے، بنگلے پر جا کہ میم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ "افسرِ اعلیٰ گھر پہنچا تو اس کی بیوی کے انتقال کا تار موجود تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی باباصاحب کے شیدائیوں میں شمار ہونے لگا۔

میڈیکل سرٹیفکیٹ:

سید عبدالوہاب نے بیان کیا۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۷ءکاذکر ہے۔ میں پوسٹ آڈٹ آفس، ناگپور میں ملازمت کی درخواست دی اور اسی روز شام مجھے ہدایت کی گئی کہ میں میڈیکل آفیسر کا سرٹیفکیٹ پیش کروں کہ میں طبّی لحاظ سے کام کرنے کے لائق ہوں۔ میں میڈیکل آفیسر کے پاس جانے سے ہچکچایا۔ کیوں کہ ان دنوں میں خارش کے مرض میں مبتلا تھا۔ اور میرے جسم پر پھوڑے نکل آئے تھے۔ قوی امید تھی کہ ڈاکٹر مجھے نوکری کا اہل قرار نہیں دے گا۔ میں پریشان ہو کر گھر گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہئے۔ خیال آیا کہ جناب عبدالحفیظ صاحب سے مشورہ کرنا چاہئے جو مجھ پر مہربان اور کرم فرماتھے۔ اور ناگپور کی کچہری کے نقشہ نویس کے معتمد تھے۔ میں نے ان کے پاس جاکر نہایت ادب اور عجز سے درخواست پیش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ باباصاحب اسکا حل نکال دیں گے۔ میں اور میرے پھوپھی زاد بھائی جو دیلور میں صفائی انسپکٹر تھے۔ پاگل خانے پہنچے ۔ ہم دونوں نے پھاٹک سے اندر داخل ہو کر چوکیدار سے باباصاحب کا پتہ پوچھا۔ دو چوکیدار ہم کو باباصاحبؒ کے پاس لے گیا۔ باباصاحبؒ ایک درخت کے نیچے تشریف فرماتھے اور سینکڑوں لوگ آپ کے گرد جمع تھے۔ چوکیدار نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ لوگ ان الفاظ میں باباصاحب کو سلام کریں۔ "السلام علیک بھائی صاحب۔" ہم نے ان ہی الفاظ میں باباصاحب کو سلام کیا۔ باباصاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ مدراسی بھائی۔ میرا وطن بھی مدراس ہے۔ دفتر لے کر آئے ہیں، دفتر لیکر جائیں گے۔"
باباصاحب کے اس طرز تخاطب سے سارا مجمع ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

اور ہمیں باباتک جانے کا راستہ دے دیا۔ میں جوں ہی باباصاحب کے قریب پہنچا۔ باباصاحب نے حکم دیا۔ "پیر دباؤ۔" پیر دباتے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ

باباصاحب بالکل بے حس و حرکت ہوگئے۔ نبض ساکت ہوگئی، سانس رک گئی اور جسم سرد پڑ گیا۔ یہ حالت دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کبھی باباصاحب کے دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن کا احساس کرتا۔ کبھی نبض پر ہاتھ رکھ کر نبض کی حرکت کا معائنہ کرتا۔ لیکن زندگی کے کوئی آثار نہیں پائے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کو اطلاع دے دوں کہ باباصاحب نے اس دنیا سے پردہ فرمالیا۔ دس پندرہ منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ میں نے لوگوں سے یہ بات کہنے کے لئے لب کھولے تھے کہ باباصاحب نے یاہو کہہ کر آنکھ کھول دی اور اٹھ بیٹھے۔ کچھ فرمایا جسے میں سمجھ نہیں سکا۔ بعدازاں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جاکر آؤ حضرت! وہ انگریز کیا کرے گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی چوکیدار نے ہم سے کہا کہ آپ جس کام کیلئے آئے تھے وہ ہوگیا ہے۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ ہم سلام کے بعد رخصت ہوئے۔

دوسرے دن میں میڈیکل آفیسر کے پاس گیا تاکہ سرٹیفکیٹ حاصل کروں۔ وہاں میرے علاوہ ۳۵ آدمی موجود تھے جو سرٹیفکیٹ کے لئے آئے تھے۔ میرا نمبر سب سے آخری تھا۔ ڈاکٹر صاحب آئے اور باری باری لوگوں کا معائنہ شروع کیا۔ ابھی میرا نمبر آیا ہی چاہتا تھا کہ لیڈی چیف کمشنر نے ڈاکٹر صاحب کو بلوایا اور وہ چلے گئے۔ وہاں سے واپس آکر ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص باقی ہے۔ تو اس نے کہا نہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا تمام لوگوں کے سرٹیفکیٹ تیار رکھو، میں آکر دستخط کردوں گا۔ یہ سن کر میں فکرمند ہوا کہ میرا طبّی معائنہ تو ہوا نہیں، پھر سرٹیفکیٹ پر کیوں کر دستخط ہوں گے۔ بہرحال میں چار بجے آفس گیا تو سرٹیفکیٹ ڈاکٹر نے دے دیا۔ حالانکہ میرا معائنہ ہوا نہیں تھا اور اگر ہو جاتا تو میرے پاس ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس واقعہ کے بعد مجھے جب بھی موقع ملتا، باباصاحب کی قدم بوسی کے لئے جاتا تھا۔

مشک کی خوشبو:

ایک دن مغرب کے وقت باباصاحب کے پاس سے واپس آرہاتھاکہ صدر دروازے پرایک صاحب ملے۔انہوں نے پوچھا۔"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟"

میں نے جواب دیاکہ میں باباتاج الدین کی خدمت سے واپس آرہاہوں۔اجنبی شخص نے دریافت کیا۔"آپ کے پاس کیاثبوت ہے کہ آپ باباصاحب کی خدمت سے واپس آرہے ہیں۔"

میں اس سوال کاجواب نہ دے سکا۔تب انہوں نے پوچھا۔"آپ باباصاحب کے پاس کیاکررہے ہیں۔"

میں نے بتایاکہ میں باباصاحب کے پیرد بارہاتھا۔اجنبی نے دونوں ہاتھ سونگھنے کو کہا۔میں نے ہاتھ سونگھے توحیران رہ گیاکہ ہاتھوں میں سے مشک کی خوشبوآرہی تھی۔ اجنبی نے میرے دونوں ہاتھ پکڑکراپنے جسم پرملناشروع کردیئے۔ہر طرف مشک کی خوشبو پھیل گئی۔میں نے بھی اپنے کپڑوں پراچھی طرح ہاتھ ملے اورگھرواپس آگیا۔گھر پہنچ کر بھی کپڑوں میں سے مشک کی خوشبوآتی رہی۔یہ معلوم نہیں ہو سکاکہ وہ صاحب کون تھے جن سے صدردروازے پرملاقات ہوئی تھی اورجن کی وجہ سے مجھے یہ خوشبو نصیب ہوئی تھی۔اس خوشبوکاعالم یہ تھاکہ کئی سالوں تک ان کپڑوں سے متواترخوشبو آتی ہی رہی۔میں نے ان کپڑوں کواتار کر تبرکاًاپنے پاس محفوظ کرلئے تھے۔

ایک بارمیں دن کے وقت حضور باباصاحب کے پاس موجود تھا۔علی گڑھ جانے والے چند طالبِ علم ایک فوٹو گرافر کولائے ،خود باباصاحب کے دونوں جانب

کھڑے ہو گئے اور فوٹو گرافر نے تصویر لے لی۔ جب فوٹو گرافر دھو کر لایا تو فوٹو میں لڑکے تو موجود تھے لیکن باباصاحب قبلہ کی شبیہ موجود نہ تھی۔

شیرو:

جس زمانے میں بابا تاج الدین واکی میں تھے، شیرو نام کا ایک کتّا باباصاحبؒ کے پاس رہتا تھا۔ شیرو کا یہ کام تھا کہ جب ریل کے آنے کا وقت ہوتا خود ہی اسٹیشن پر پہنچ جاتا اور جو لوگ بابا صاحب کے پاس آتے ان کی رہنمائی کر کے اسٹیشن سے واکی میں بابا صاحب کی قیام گاہ تک لاتا۔ طریقۂ کار یہ ہوتا تھا کہ ریل آجانے کے کچھ دیر بعد شیرو واکی کی طرف چل پڑتا اور لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔ لوگوں کو شیرو کے معمول کا علم تھا اور جو نئے آنے والے ہوتے انہیں بتا دیا جاتا تھا۔ اگر باباصاحبؒ اپنی قیام گاہ کے بجائے کہیں اور ہوتے تو شیرو لوگوں کو وہیں لے کر جاتا تھا۔ ایک واقفِ حال صاحب واکی آئے لیکن شیرو کو اسٹیشن پر موجود نہ پاکر وہ سوچنے لگے کہ نہ جانے آج شیرو کیوں نہیں آیا۔ غرض تمام آنے والے خود ہی واکی کی طرف روانہ ہوئے اور راستے میں شیرو کے کام اور اس کی مستعدی کی تعریف کرتے رہے۔ جب سب لوگ باباصاحبؒ کی قیام گاہ پہنچے تو بابا صاحبؒ وہاں موجود نہ تھے۔ لوگ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے کہ ان کو تلاش کریں۔ یہ صاحبؒ کسی دوسرے راستے سے جنگل کو چلے راستے میں دیکھا کہ شیرو مرا پڑا ہے۔ ابھی کچھ دور آگے گئے تھے کہ بابا تاج الدینؒ اسی طرف آتے دکھائی دیئے۔ بعد قدم بوسی ان صاحب نے عرض کیا۔ "حضور! آپ کا شیرو جو لوگوں کو آسانی سے آپ تک لاتا تھا، مر گیا۔" یہ سن کر باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "نہیں رے! چل دیکھیں کہاں ہے۔"

وہ صاحب باباصاحبؒ کو لیکر وہاں پہنچے جہاں شیر وپڑا تھا۔ باباصاحب نے کہا اسے ٹوکری میں ڈال کر ہمارے ساتھ لے چلو۔

جب شیر و کو ٹوکری میں ڈالا گیا تو باباصاحبؒ نے اس پر اپنا جبہ ڈال دیا۔ یہ صاحب ٹوکری لے کر کچھ ہی دور باباصاحب کے ساتھ گئے تھے کہ ٹوکری میں حرکت ہوئی اور شیر وٹوکری سے نیچے کودا۔ کچھ عرصے بعد شیر و پھر مر گیا۔ باباصاحب نے اپنا جبہ دے کر حکم دیا کہ اسے شفاخانے کے پاس دفن کر دو۔

مردے کو زندہ کر دینا بظاہر بڑی عجیب بات دکھائی دیتی ہے لیکن یہ قانونِ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالٰی نے آدمؑ کا اپنی صفات کو جو علم (علم الاسماء) سکھایا تھا اس میں ایک اسم رحیم بھی ہے۔ رحیم کی صفت ہے تخلیق یعنی پیدا کرنا۔ چنانچہ پیدائش کی جس قدر طرزیں موجودات میں استعمال ہوئیں ہیں، ان سب کا محرک اور خالق رحیم ہے۔ اگر کوئی شخص رحیم کی جزوی صفت کا فائدہ اٹھانا چاہے تو اس میں رحیم کی صفت کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اپنے باطن میں کرنا ہو گا۔ نیابت اور خلافتِ الٰہیہ کے تحت انسان کی روح کو اسم رحیم کے تصرفات کی صلاحیتیں پوری طرح حاصل ہیں اور اللہ تعالٰی کی طرف سے اس صفت کے استعمال کا حق بھی حاصل ہے۔ اللہ تعالٰی نے حضرت عیسیٰؑ کی مثال دے کر اس صفت کی وضاحت کر دی ہے۔ ارشاد باریٔ تعالٰی ہے۔

ترجمہ: اور جو تو بناتا مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے، پھر دم مارتا اس میں تو ہو جاتا جانور میرے حکم سے اور چنگا کرتا ماں کے پیٹ کا اندھا اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑے کرتا مردے میرے حکم سے۔

اگر کوئی انسان اس صفت کی صلاحیت کو استعمال کرنا چاہے تو اسے مراقبہ کے ذریعہ اپنے اندر اس فکر کو مستحکم کرنا پڑے گا کہ میری ذات اسمِ رحیم کی صفات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودات کی جس قدر شکلیں اور صورتیں ہیں وہ سب اسمِ رحیم کی صفات کا نوعی مجموعہ ہیں۔ یہ مجموعہ انسان کی روح کو حاصل ہے۔ جب کوئی شخص فکر کی پوری مشق حاصل کرنے کے بعد اسمِ رحیم کی صفت کو خود سے الگ شکل و صورت دینے کا ارادہ کرے گا یا کسی زندہ کو مردہ کرنا چاہے گا تو نیابتِ الٰہی کے تحت اس کا اختیار حرکت میں آئے گا۔ اور صفت کا مظہر اس ذی روح کی شکل و صورت اختیار کرے گا۔ جس کو وجود میں لانا مقصود ہے۔ یا وہ دیکھے گا کہ اس کی روح سے اسمِ رحیم کی صفت روح بن کر اس مردے میں منتقل ہو رہی ہے۔ جس کو وہ زندہ کرنا چاہتا ہے۔

سر کشن پرشاد کی حاضری:

مہاراجہ سر کشن پرشاد حیدر آباد دکن کے طبقۂ امراء سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک عرصہ تک حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم بھی رہے۔ مہاراجہ شیر و سخن کے علاوہ تصنیف و تالیف میں بھی خاصہ درک رکھتے تھے۔ مہاراجہ کے سفر نامے اردو زبان کے معیاری سفر ناموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ سر کشن پرشاد کے مطبوعہ سفر ناموں میں "سیر ناگپور" نامی ایک مختصر سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامہ میں بابا تاج الدینؒ ناگپوری کا تذکرہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی سفر نامے کے اہم مندرجات پیش کر رہے ہیں۔

تین مہینے ہوئے میرے عزیز باتمیز سید معین الدین خان نبیرۂ سردار عبد الحق، دلیر الملک مرحوم نے مجھ سے برِ سبیل تذکرہ کہا تھا کہ ناگپور کے پرے واکی اسٹیشن کے

قریب ایک بزرگ تاج الدین شاہ ولی کے نام سے مشہور ہیں۔ نہایت کامل اور مستجابات الدعواۃ ہیں۔ ان کی رطب اللسانی کا تخم میرے دل میں بویا گیا اور شوق وذوق دید و درشن کی آبیاری سے اس کی پرورش شروع ہوئی۔ کمسنی سے مجھے بزرگوں کے ساتھ ملا قید ملت و مذہب کی ایک خاص قسم کی عقیدت ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ میری گھٹی میں عقیدت کا پٹ پڑا ہے۔ اگرچہ انہیں دنوں میں طائرِ ارادہ کو تحریک ہوئی کہ چل کر درشن کر لوں لیکن کلُّ اَمرٍ مرہُونٌ باَوقَاتِھا کے سبب پر پرواز شکستہ تھے۔ اس لئے یہ بات اور ارادہ رفت و گزشت ہو گیا۔ دنیا عالم اسباب ہے۔ کسی سبب کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ جس نتیجہ یہ ہوا کہ میرا تیسرا لڑکا عثمان پرشاد عدمؔ بروزِ دندان کے باعث علیل ہو گیا۔ اس میں طوالت پیدا ہوئی اور بخار لازمی ہو گیا۔ ۱۰۰ اور ۱۰۲ کے درمیان اس کا اتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔

ماہر ڈاکٹروں اور نامی گرامی اطباء کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن بچہ کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ لوگوں کے مشورے پر سرکشن پرشاد بچے، اس کی والدہ اور بہن کو ساتھ لے کر وقار آباد چلے گئے۔ تا کہ تبدیلِ آب وہوا سے بچہ کے طبیعت پر خوشگوار اثر پڑے۔ وقار آباد کا فاصلہ حیدر آباد سے بذریعۂ ریل دو گھنٹہ کا تھا۔ اس دوران مہاراجہ کی لڑکی کی شادی بھی تھی۔ وقار آباد میں بھی بچے کی طبیعت میں افاقہ نہیں بلکہ بگڑ گئی۔ شادی کی مجبوری سے مہاراجہ حیدر آباد واپس آئے۔ اور ۷ جمادی الآخر کو منگنی کی رسم ادا کی۔ اسی رات دو بجے بچے کی طبیعت مزید خراب ہوئی اور دوسری صبح بہت بگڑ گئی۔ مہاراجہ سخت پریشان ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں

"طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ اپنے پیارے کی حالت یہاں رہ کر دیکھوں، فوراً ریل پہ سیلون کا انتظام کر کے میں نے اپنے والدِ ماجد کو لکھ دیا کہ فی الحال شادی ملتوی کر دی جائے۔ ہفتہ عشرہ کے لئے میں بغرضِ تبدیلِ آب وہوا جاتا ہوں۔ ورنہ میری صحت پر

برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ ۸ؔ تاریخ، روزِ پنجشنبہ، وقتِ مغرب سب کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے بحالتِ استرار روانہ ہوا۔ اس برخوردار کی والدہ سے کہہ دیا کہ خدا کی نظر پر رکھ کر دعا کرتی رہیں۔ ان شاءاللہ جب بخار میں کمی محسوس ہو گی۔ اس وقت واپس ہوؤں گا"۔

چلتے وقت بعض احباب نے مشورہ دیا کہ جب سفر پر روانہ ہو ہی رہے ہیں تو بہتر ہے کہ ناگپور کی طرف جا کر حضرت تاج الدینؒ بابا کے بھی درشن کر لیں۔ یہ بات مہاراجہ کے دل کو لگی اور وہ ناگپور کی سمت روانہ ہوئے۔

ناگپور پہنچ کر راجہ صاحب کو پتہ چلا کہ باباتاج الدینؒ راجہ رگھوجی کے مکان میں رہتے ہیں۔ راجہ صاحب نے بغیر تعرف اور اجازت کے وہاں جانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اپنے منصب دار مرزا احمد بیگ کو باباصاحب کی خدمت میں سلام پہنچانے کا حکم دیا۔ مرزا احمد بیگ اس وقت باباصاحب کی خدمت میں پہنچے، باباصاحب لیٹے ہوئے تھے۔ موقع مناسب دیکھ کر مرزا احمد نے مہاراجہ کا سلام پہنچایا۔ باباصاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"چراغ رکھ کر چراغ کی فکر کرتا ہے، کہہ دے گھر کو چلا جائے۔"

مہاراجہ کشن پرشاد کو جب یہ جواب سنایا گیا تو انہوں نے اسے اپنے لئے ایک خوش خبری سمجھا لیکن ایک بات ان کے دل کے گوشے میں کھٹک رہی تھی کہ باباصاحب مجذوبانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ اس اشارے سے ان کا کوئی اور مطلب تو نہیں۔

دوسرے دن صبح گھر سے تار آیا کہ رات کو بچے کی حالت زیادہ خراب تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد بے چین ہو گئے۔ اور ایک مصاحب رام چندر پرشاد سے کہا کہ آج کسی

نہ کسی طرح باباتاج الدین صاحب کے درشن سے فیض حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا کوئی موٹر خواہ کرائے کی ہو حاصل کرو۔

تھوڑی کوشش کے بعد موٹر مل گئی۔ ۴ بجے لباس تبدیل کر کے اپنے دو مصاحبوں کے ساتھ ہواخوری کے لئے نکلے۔ مہاراجہ لکھتے ہیں۔

جہاں تک گیااور دیکھاناگپور کی بستی کو خوشنما پایا، سڑکیں سینۂ بے کینہ کی طرح صاف۔ اس کے دورویہ گھنے درخت مسافر اور رہ گزر پر سایہ ڈالتے ہیں۔ مکانات کی باقاعدہ سجل قطار راستے بسی۔

چلتے چلتے راجہ کے اس باغ تک پہنچے جہاں باباصاحب مقیم تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ باباصاحب موجود ہیں مہاراجہ کشن پرشاد فوراً موٹر سے اتر کر اندر داخل ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

دیکھتا کیا ہوں کہ زائرین کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ اور منتظرِ فضلِ باری ہیں اور مجزوب کے مظہر کو اپنا قاضی الحاجات سمجھ کر اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہیں۔ اور مظہرِ ذاتِ متناہی معبودیت کے خلوت سے مزین ہو کر مجزوب کی تصویر بن کر ہر ایک کے درد کی دوا کرنے میں اپنی مسیحائی دکھا رہا ہے۔ جل جلالہ جل شانہ۔اس وقت باباصاحب دوسری طرف متوجہ تھے۔ میرے پسِ پشت جا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ چونک کر فوراً میری طرف دیکھ کر نظر ملائی۔ نظر کا ملنا تھا کہ میرے قلب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار قلم سے ممکن نہیں۔ درحقیقت ان کی نسبت نہایت قوی اور نظر میں برقی قوت تھی۔ میں نے بھی ان کی دید سے نظر نہیں چرائی۔ دس منٹ یا اس کچھ زائد عرصہ ہوا ہوگا۔ بقول شخصے

دید تو مغز است باقی پوست است

دید آں باشد کہ دید دوست است

اس دید بازی کے مزے خوب ملے۔ اس کے بعد باباصاحب نے کہا۔ "شرارتیں کرتے ہو، جاؤ سیدھے گھر جاؤ۔"

میں سلام کرکے واپس ہوا۔ اگرچہ بعض کا خیال ہوا کہ میں ان سے کچھ کہوں۔ مگر ان کی زبردست نسبت نے مجھے ہر طرح مطمئن کر دیا تھا۔ جب تھوڑی دور تک میں چلا تو میرے پیچھے ہی آئے اور ایک مائی صحابہ بیٹھی تھیں ان سے چوڑی لی اور مجھے دے کر کہا۔ "لو بس اب تو جاؤ گے۔" میں نے چوڑی لی اور اس کا تفاول بھی نیک خیال میں آیا۔ میں پھر سلام کر کے واپس ہوا۔ میرے ساتھ آئے میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں کبوتر اڑ رہے تھے ان کی طرف مخاطب ہو کر درختوں کے گملوں میں سے کچھ مٹی اٹھائی اور کبوتروں کی طرف ڈال کر خدا جانے کیا فرماتے رہے۔ میں تو ان کی دید میں محو تھا۔ اس اثنا میں ایک معتقد سگریٹ روشن کر کے باباصاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ نے فوراً میرے طرف دیکھ کر اس سے کہا "یہ تو ان کو دے دو، یہ پئیں گے۔ ان کے واسطے "اور وہ سگریٹ مجھ کو عنایت فرمایا۔ میں نے اس کو لے لیا۔ جب میں جانے لگا تو جیسے فوجی سلام کرتے ہیں۔ اسی طرح سلام کر کے یہ الفاظ کہے۔

All right and good morning (یعنی سب کچھ بہتر ہے) صَبَّحَکَ اللہ۔

اس سے بہتر اور تفاول نیک اور جامع اور کیا کیا ہو سکتا تھا۔ میں پھر سلام کر کے رخصت ہوا۔ پھر میرے ساتھ ساتھ وہاں تک آئے جہاں میں موٹر سے اترا تھا۔ وہاں سے وہ دوسری طرف چلے گئے اور میں خدا حافظ کہہ کر اپنی فرودگاہ کی طرف روانہ ہوا۔

آخر میں مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے سفر نامۂ ناگپور اس بیان پر ختم کر دیا ہے۔ادھر زلفِ یار نے کمر تک رسائی کی۔اور ادھر نصف شب نے سیاہ چادر کمر تک تان لی۔

جَعَلَ اللَّيْلَ لِبَاساً کے حکم کے مطابق بستر پر دراز ہو گیا۔دوسرے روز منماڑ پہنچا۔وہاں بذریعہ تار اطلاع ہوئی کہ برخوردار کا مزاج روبہ اصلاح ہے۔ڈاکٹر ہنٹ نے کہہ دیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ٹمپریچر ۱۰۱ سے زیادہ نہیں ہے۔الحمد للہ المنت یہ نوید مسرت آمیز کے سننے سے دل شاد باغ باغ ہوا۔وہاں سے سیلون بدل کیا گیا۔میٹر گیج لائن کا ایک سیلون سے لے کر اورنگ آباد کے راستے سے چہار شنبہ کے روز، چار بجے کی ٹرین میں الوال میں داخل ہوا۔اور وہاں سے بذریعۂ موٹر مکان میں آیا۔اور سب کو خیر وعافیت کے ساتھ پایا۔ سجدۂ شکر بجالایا اور شادی کے آغاز کے لئے حکم دے دیا۔خدائے تعالیٰ ہمیشہ ہر بات کا انجام بخیر کرے۔

سفر نامے کی تاریخ کے متعلق پتہ چلا کہ غزہ جمادی الآخر ۱۳۳۱ھ کو ۸ر مئی ۱۹۱۳ء اور روزِ پنجشنبہ تھا۔مہاراجہ کے بیان کے مطابق ۷ر تاریخ کو منگنی ہوئی۔۸ر تاریخ روزِ پنجشنبہ کو بچے کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔اسی روز مہاراجہ حالتِ استرار میں ناگپور کی طرف نکل گئے۔ واپسی چہار شنبہ کو عمل میں آئی۔اسی طرح یہ ثابت ہوا کہ ۸ر جمادی الآخر ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۵ر مئی ۱۹۱۳ء روزِ پنجشنبہ کو آغازِ سفر کیا۔ اور ساتویں روز ۱۴ر جمادی الآخر مطابق ۲۱ر مئی کو حیدر آباد واپس آئے۔اس لحاظ سے یہ سفر ۷ر دن کا ہوتا ہے۔مہاراجہ کشن پرشاد دوسری دفعہ باباصاحب کی خدمت میں آئے تو نظام دکن کا ایک فرمان بھی ساتھ لائے ، جس میں کچھ جاگیر نظام میں باباصاحب کی نذر کی تھی۔ باباصاحب نے فرمان چاک کرتے ہوئے کہا۔

"نظام دکن کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کہ زمین کے مالک کو زمین نذر کرتا ہے۔ اس سے کہو کہ ہم نے تم کو زمین دے رکھی ہے۔"

لڈو اور اولاد:

ایک بار دو ہندو عورتیں، مراوٗتی سے بابا تاج الدینؒ کے پاس آئیں۔ان دونوں عورتوں کی شادی کو بارہ چودہ سال گزر گئے تھے۔ لیکن اولاد سے محروم تھیں۔ باباصاحب ندی کے پاس ریت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک جھولی میں سے دو لڈو نکالے اور چکھ کر ان عورتوں کو دیتے ہوئے کہا۔ "کھالو!" ایک عورت نے لڈو کھالیا لیکن دوسری نے نظر بچا کر ریت میں دبا دیا۔ دوسرے دن یہ عورتیں اپنے گھر چلی گئیں۔ وقتِ مقررہ کے بعد وہ عورت جس نے لڈو کھایا تھا ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔ لیکن دوسری جس نے لڈو ریت میں دبا دیا تھا، اولاد سے محروم رہی۔ اسے سخت افسوس اور پشیمانی ہوئی۔ بچے کی پیدائش کے دو ماہ بعد صاحبِ اولاد عورت بچے کو ساتھ لے کر باباصاحب کی خدمت میں روانہ ہوئی تاکہ ناگپور میں بال اتارنے کی رسم انجام دے۔ اس نے اپنی سہیلی کو بھی جو اولاد سے محروم رہی تھی ساتھ لیا اور کہا۔ "فکر نہ کر۔ باباحضور سے دوبارہ کہیں گے۔ بھگوان نے چاہا تو تیرے آنگن میں بھی بہار آئے گی۔" سہیلی دل میں روتی اور افسوس کرتی مجبوراً ساتھ ہولی۔ جب یہ دونوں باباصاحب کے پاس پہنچیں تو عجیب بات دیکھی کہ بابا ندی کے کنارے اسی مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں ان کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی تھی۔ بامراد عورت نے اپنا بچہ باباصاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر دوسری عورت تاب نہ لا سکی۔ روتی ہوئی باباصاحب کے قدموں پر گری اور کہا "باباجی، میرا بچہ؟" باباصاحب نے جواب دیا۔ "ریت میں ہے، نکال لے۔" لوگوں نے یہ منظر

دیکھا تو حال پوچھا۔ عورت نے سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ جب تک باباصاحب مجھے آشیر واد دے کر روانہ نہ کریں گے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ تیسرے روز باباصاحب نے اس عورت کو دعا سے نواز کر روانہ کیا اور وہ بھی صاحبِ اولاد ہوئی۔

سزائے موت:

عبدالحسن صاحب، فروٹ مرچنٹ بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ نیاز کی غرض سے باباتاج الدینؒ کی خدمت میں واکی گئے۔ ابھی کھانا پکانے کا سامان ہو رہا تھا کہ بادل چھا گئے۔ جلدی جلدی چاول دیگ میں ڈالے ہی تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ دیگوں کے نیچے کی آگ بجھ گئی اور ایندھن کی لکڑیاں بہہ گئیں۔ وہاں موجود لوگوں نے ہمارا مزاق اڑانا شروع کر دیا کہ ان کی تو نیت ہی خراب تھی جب ہی تو لکڑیاں بہہ گئیں۔ ہم لوگ شرمندہ ہوئے اور ارادہ کیا کہ جب بارش رک جائے گی تو دوسری دیگ چڑھائیں گے۔ اتنے میں ایک قیدی جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئیں تھیں، دو تین کانسٹیبلوں کے ہمراہ باباصاحب کے پاس آیا۔ اس نے باباصاحب سے عرض کیا۔ "عدالت نے مجھے پھانسی کی سزا سنادی ہے۔ اور میں اجازت لے کر آپ کے درشن کے لئے آیا ہوں۔ مجھے آشیر واد دیجئے کہ میری مکتی ہو جائے۔ باباصاحب نے فرمایا۔ " جارے، الٹے ہاتھ سے سلام کر کے آ، بری ہو جائے گا۔ " یہ کہہ کر باباصاحب نے میرے والد صاحب سے کہا۔ "ان کو نیاز کا کھانا کھلا۔ " ہم نے اٹھ کر دیگ کھولی تو کیا دیکھتے ہیں کہ کھانا پکا پکایا تیار ہے۔ حالانکہ اس کے نیچے کوئی آگ نہیں تھی اور اس وقت بھی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہم نے بشمولِ قیدی تمام حاضرین کو کھانا کھلایا۔ میرے والد نے قیدی سے پوچھا کہ تمہیں کس بات پر سزا ہوئی ہے۔ اس نے بتایا کہ میں نے اپنے ملازم کو اپنی لڑکی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر چاہا کہ دونوں کو قتل کر دوں لیکن لڑکی فرار ہو گئی اور ملازم میرے ہاتھوں مارا گیا۔

اب مجھے یقین ہے کہ اپیل کروں گا تو بری جاؤں گا کیوں کہ باباصاحب نے اپیل کرنے کا اشارہ کیاہے۔ چنانچہ ایساہی ہوا۔اس نے اپیل کی اور موت کی سزا سے بری ہو گیا۔

دست گیر:

بمبئی کی ایک طوائف بیان کرتی ہیں۔ جب سے میں نے حضور باباصاحب کا تذکرہ سنا اور آپ کی غرباپروری، خطاکاروں کی پردہ داری اور ان پر شفقت و محبت کے واقعات سنے مجھے باباصاحب سے دلی تعلق ہو گیا۔ اور میں نے خود کو باباصاحب کے ارادت مندوں میں شمار کرنا شروع کر دیاہے۔ایک دفعہ میں اپنی خطاکاریوں کے باعث آتشک میں مبتلا ہو گئی۔ میری حالت اتنی خراب ہو گئی کہ میں نے خود کو بالا خانے سے گرا کر جان دینے کا ارادہ کر لیا۔ یہ فیصلہ کر کے میں بستر سے اٹھی اور بالا خانے پر چلی۔ چلتے ہوئے میری نظر دیوار پر لگی ہوئی باباصاحب کی تصویر پر پڑی۔ شبیہ مبارک کو دیکھ کر میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور باباصاحب کو مخاطب کیا۔اے کاش میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتی تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی اور مجھ سے ایسے قبیح افعال سرزرد نہ ہوتے۔ میں رو رو کر باباصاحب سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ یکایک محسوس ہوا کہ کسی غیبی ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑا اور بستر کی جانب لے کر چلا۔ میں بے اختیار اس قوت کے زیرِ اثر جاکر بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹے لیٹے مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا اور میں نے دیکھا کہ حضور باباصاحب تشریف لائے ہیں۔اپنی انگشتِ شہادت سے لعابِ دہن لگایا۔ پھوڑا گیا اور مواد خارج ہونے لگا۔ میری آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ واقعی مواد بہہ رہاہے۔ اس کے بعد سے اس مرض کا مکمل خاتمہ ہو گیا اور میں نے گناہ آلود زندگی سے توبہ کر لی۔

اب ہر وقت باباصاحب کا تصور میرے ساتھ رہتا ہے۔اور مجھے باباصاحب کے تعلق سے ایسے دلی اطمینان نصیب ہوا ہے جس کا لطف بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔

دو تھال میں سارا ہے:

سید عبدالرحمٰن صاحب جو سی پی گورنمنٹ کے فاریسٹ کانٹریکٹر تھے۔ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں باباتاج الدینؒ کے پاس موجود تھا کہ ایک چور باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوااور ایک طرف بیٹھ کر دل ہی دل میں باباصاحب سے مخاطب ہوا کہ حضور مجھ سے چوری کا ارتکاب ہوا ہے اور میں نے ایک حلوائی کے یہاں چوری کی ہے۔ میں اس فعل پر سخت نادم ہوں۔ چاہتا ہوں کہ آپ میری پردہ داری کرتے ہوئے مجھے سزا سے بچالیجئے۔اس خاموش عرض کے جواب میں باباصاحب نے اس کی طرف رخ کرکے کہا۔"بھاگ جا، تیرا کام ہو گیا۔"

اتنے میں وہ حلوائی بھی جس کے یہاں چوری ہوئی تھی، حاضرِ دربار ہوااور فریاد کی کہ حضور میں لٹ گیا۔ میری تمام کمائی کسی نے چرا لی۔ باباصاحب نے ارشاد فرمایا۔"ارے جا دو تھال میں سارا ہے۔اس کا کام بھی ہو گیا ہے تیرا بھی ہو جاتا۔ جااور دوکان کھول"

حلوائی واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ سارا مال اور پونجی تو چوری ہو چکی لیکن دو تھال چراؤنجی دانوں سے بھرے بچ گئے۔ اسے باباصاحب کا ارشاد یاد تھا کہ دو تھال میں سارا ہے۔اس نے مکمل یقین کے ساتھ ان دو تھالوں سے دوبارہ کاروبار شروع کیا۔ حالات بہت تیزی سے اس کے حق میں سازگار ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ پہلے سے زیادہ معاشی فراغی حاصل ہو گئی۔

بد کردار لڑکا:

گونڈیاصاحب میونسپل میں محرر تھے۔ان کابیٹااندر کجروی کے باعث جلندھر کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔اور مرض کی پیچیدگی روز بروز اتنی بڑھی کہ علاج کی امید دم توڑنے لگی۔ اس ابتر حالت میں گونڈیا صاحب اپنے لڑکے کو شکر درہ باباصاحب کی خدمت میں لائے۔ دودن تک باباصاحب نے کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن تیسرے دن اچانک اٹھے اور لڑکے کے پاس جا بیٹھے۔ بیٹھنے کے بعد چائے طلب کی اور ایک دو گھونٹ پی کر مریض اندر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"لے چائے، پی لے۔"

مرض کی شدت سے لڑکااپنے ہوش میں نہیں تھا۔اس نے چائے کی پیش کش کا کوئی جواب نہیں دیا۔ باباصاحب نے دوبارہ کہاچائے پی لے۔

اندر نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ تیسری بار باباصاحب بے جلال میں چائے کا گلاس اندر کے منہ سے لگادیا۔ بے حس وحرکت اور بے ہوش اندر نے ہونٹ کھول دیئے اور چائے حلق سے اترتی چلی گئی۔ لگتا تھا کہ چائے نہیں آبِ حیات اس کے حلق میں جا رہاہے۔چائے پینے کے بعد وہ اٹھااور ایک ہفتے میں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

اجمیر یہیں ہے:

ایک صاحب نے باباصاحب سے درخواست کی کہ بابا میں اجمیر جاناچاہتاہوں ۔ باباصاحب نے فرمایا کہ اجمیر یہیں ہے کہاں جاتاہے۔ یہ کہہ کر باباصاحب نے ان صاحب کے ہاتھ پر اپناہاتھ رکھ دیا۔ وہ صاحب اپنے ماحول سے بے خبر ہو گئے۔اور دیکھا کہ اجمیر شریف کی سیر کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد باباصاحب نے ان کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایاتوانہوں نے خود کو باباصاحب کی خدمت میں موجود پایا۔

اس کرامت کی توجیح قلندر باباؒ کے ان ارشادات سے ہوتی ہے۔انسان کی ذات کاایک حصہ داخلی ہےاور دوسرا خارجی۔داخلی حصہ اصل ہےاور خارجی حصہ اس ہی اصل کا سایہ ہے۔داخلی حصہ میں زمان اور مکان نہیں ہوتے۔لیکن خارجی حصہ میں زمان اور مکان دونوں ہوتے ہیں۔داخلی حصہ میں ہر چیز جزولایتجزا کی حیثیت رکھتی ہے۔کسی مکانیت کااحاطہ نہیں کرتی۔صرف مشاہدہ ہوتی ہے۔مکانیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر زمانیت بھی نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر ہم کسی امارت کی ایک سمت میں کھڑے ہو کر اس امارت کے ایک زاویہ کو دیکھتے ہیں۔جب اس امارت کے دوسرے زاویہ کو دیکھنا ہوتا ہے تو کچھ قدم چل کے اور کچھ فاصلہ طے کر کے ایسی جگہ کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے امارت کے دوسرے رخ پر نظر پڑتی ہے۔نگاہ کازاویہ تبدیل کرنے میں چند قدم کا فاصلہ طے کرناپڑا اور فاصلہ طے کرنے میں تھوڑاساوقفہ بھی صرف ہوا۔اس طرح ایک نظر کازاویہ بنانے کے لئے مکانیت اور زمانیت دونوں وقوع میں آئی۔ذراوضاحت سے اس بات کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جب ایک شخص لندن ٹاور کو دیکھنا چاہے تو کراچی سے سفر کر کے اس کو لندن پہنچناپڑے گا۔ایسا کرنے میں اس کو ہزاروں میل کی مکانیت اور کئی دنوں کا زمانہ لگاناپڑا۔اب نگاہ کا وہ زاویہ بنا جس سے لندن ٹاور دیکھا جا سکتا ہے۔مقصد صرف نگاہ کا وہ زاویہ بنانا تھاجو لندن ٹاور کو دکھا سکے۔یہ انسان کی ذات کے خارجی حصہ کازاویۂ نگاہ ہے۔

اس زاویہ میں مکانیت اور زمانیت استعمال ہونے سے کثرت پیداہو گئی۔اگر ذات کے داخلی زاویۂ نگاہ سے کام لیناہو توہم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ذہن میں لندن ٹاور کا تصور کر سکتے ہیں۔تصور کرنے کے لئے جو نگاہ استعمال ہوتی ہے وہ اپنی توانائی کی وجہ سے ایک دھندلہ ساخاکہ دکھاتی ہے لیکن زاویہ ضرور بنادیتی ہے جو ایک طویل سفر کر کے لندن

ٹاور تک پہنچنے کے بعد ٹاور کو دیکھنے میں بنتا ہے۔ اگر کسی جگہ نگاہ کی ناتوانی دور ہو جائے تو زاویہ نگاہ کا دھندلہ خاکہ روشن اور واضح نظارے کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔اور دیکھنے کا مقصد بالکل اسی طرح پورا ہو جائے گا جو سفر کی جدوجہد اور سفر کے بہت سے وسائل استعمال کرنے کے بعد پورا ہوتا ہے۔

باباتاج الدینؒ اولیاء نے تصرف کے ذریعے سائل کی نظر میں وہ زاویہ پیدا کر دیا جو اجمیر شریف کے نظارے کے لئے درکار تھا۔اور اس نے اجمیر شریف کی سیر بالکل اسی طرح کر لی جیسے وہ وہاں موجود ہو۔

یہ اچھا پڑھے گا:

مسٹر وی ایس سوم سندرم کہتے ہیں کہ جن دنوں ہم شکر درہ میں مقیم تھے، میری لڑکی باباصاحبؒ کی خدمت میں جاتی تو اس کا بیٹا مدن گوپال بھی ساتھ ہوتا تھا۔ مدن گوپال بات بات پر ضد کرتا تھا۔ایک دن باباصاحبؒ نے مدن سے کہا۔"کیوں رے! ماں کو ستایا۔" یہ کہہ کر ایک کتاب مدن گوپال کو دی اور کہا۔"یہ پڑھو! "پھر لڑکی سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا۔"یہ اچھا پڑھے گا۔"

باباصاحبؒ کی بشارت پوری ہوئی۔ مدن گوپال نے ایم بی بی ایس کی ڈگری لینے کے بعد برطانیہ سے امراضِ چشم کی سرجری کی اعلیٰ ڈگریاں لیں۔

بارش میں آگ:

ایک دفعہ سخت خشک سالی ہوگئی۔ پانی کی کمی سے فصلیں متاثر ہونے لگیں اور چارے کی کم یابی سے مویشی مرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے باباالدینؒ سے کہا۔" بابا صاحبؒ یہ سن کر مسکرائے اور جنگل کی طرف چل دیئے۔لوگ ساتھ ہو لئے۔ایک گاؤں

میں پہنچے تو وہاں کے کسانوں نے باباصاحبؒ سے کہا۔" باباصاحب! خشک سالی سے ہماری فصلیں تباہ ہو رہی ہیں اور مویشی مر رہے ہیں۔

یہ سن کر باباصاحبؒ کی کیفیت ایک دم بدل گئی۔ جلال میں آکر پانی طلب کیا۔ایک کسان نے لوٹے میں پانی بھر کر پیش کیا۔ باباصاحبؒ نے لکڑیاں جمع کرا کے آگ جلائی اور لوٹے کی ٹونٹی سے تھوڑا تھوڑا پانی آگ پر ڈالنا شروع کیا۔ پانی کے قطرے سلگتی لکڑیوں پر گرنے اور لمحہ بھر میں بھاپ بن کر اُوپر کا رخ کرتے۔ جوں جوں یہ آبی بخارات اُوپر جارہے تھے لوگوں نے دیکھا کہ آسمان ابر آلود ہوتا جارہا تھا۔لوٹے کا پانی ختم ہوتے ہی آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور کچھ ہی دیر بعد تیز بارش شروع ہوگئی۔

چھوت چھات:

دربار تاج الاولیاء کے حاضر باش لوگوں، عقیدت مندوں اور زائرین کو معمول تھا کہ وہ مختلف قسم کے کھانے پکا کر باباصاحبؒ کو پیش کرتے۔ باباصاحبؒ کسی میں سے کچھ لیتے۔ باقی بھی باباصاحبؒ کے حلق سے نہ اترتا۔ کھانا پکا کر پیش کرنے والوں میں بڑے بڑے صاحبِ حیثیت لوگ، عالم رؤسا اور نواب تک شامل تھے۔

ایک مہترانی (ہندو خاکروب عورت) کی دلی تمنا تھی کہ وہ بھی کچھ پکا کر باباصاحبؒ کی خدمت میں پیش کرے۔ایک عرصہ سے یہ خواہش اس کے دل میں مچل رہی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ باباصاحبؒ کے حضور کھانا پیش کرنے والوں میں بڑے بڑے امراء اور اونچی ذات کو لوگ ہوتے ہیں۔ مجھ نیچ ذات کو کون پوچھے گا۔ پتہ نہیں لوگ یہ کھانا پیش کرنے کی اجازت دیں گے بھی یا نہیں۔ خلوص کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دن وہ اپنی بساط کے مطابق کھانا پکا کر شکردرہ لائی لیکن نیچ

ذات ہونے کے خیال نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم پھر روک دیئے۔ خوف کے مارے اس نے اپنا کھانا ایک امرود کے درخت سے باندھ دیا۔

باباتاج الدینؒ راجہ رگھوجی کے محل میں موجود تھے۔ کھانے کے وقت انہوں نے کھانا طلب کیا۔ حاضرین نے اپنے توشے دان کھول کر پیش کئے۔ باباصاحبؒ نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ فرمایا۔ "یہ نہیں کھاتے۔ وہ کھانا لاؤ جو درخت سے بندھا ہے۔"

کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ کون سا کھانا ہے جو درخت سے بندھا ہے۔ حاضرین اِدھر اُدھر دیکھ کر خاموش ہو رہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ مہترانی دور جاکر ایک جگہ بیٹھ گئی اور وہاں سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ لوگوں نے بارہا کوشش کی کہ باباصاحبؒ کسی توشہ دان سے کھانا کھالیں لیکن باباصاحبؒ نے کسی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ برابر یہی کہہ رہے تھے کہ وہ کھانا لاؤ جو درخت سے بندھا ہے۔ کچھ دیر بعد باباصاحبؒ خود اٹھے اور محل سے باہر اسی امرود کے درخت کے پاس پہنچے جس سے مہترانی کا کھانا بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے توشہ دان اتار کر کھولا اور وہیں بیٹھ کر کھایا۔

لوگ یہ معلوم کرنے میں لگ گئے کہ توشے دان کا مالک کون ہے۔ آخر مہترانی نے جاکر سارا معاملہ بتایا۔ اور خود فرطِ خوشی سے جھومنے لگی۔ اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔

مناسکِ حج:

ایک ضعیف العمر صاحب مدراس سے باباصاحبؒ کے پاس آئے اور کہا۔ "حضور! آپ کے پاس راجہ، نواب اور صاحبِ حیثیت لوگ بھی آتے ہیں۔ کسی سے

اتنی رقم دلوادیجئے کہ میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرلوں۔ یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے۔"

باباصاحبؒ نے انہیں اطمینان دلایا۔ دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ حج پر جانے کا وقت قریب آگیا۔ ان صاحب نے دوبارہ عرض کیا۔ یہ صاحب نہایت مضطرب اور بے چین حج سے ایک روز پہلے باباصاحبؒ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا۔ "حضور کل سے حج شروع ہوجائے گا لیکن آپ نے حج پر جانے میں میری کوئی مدد نہیں کی۔"

اگلے دن باباصاحبؒ حسبِ معمول باہر نکلے تو ان صاحب نے دوبارہ اپنی بے چینی اور محرومی کا ذکر کیا۔ باباصاحبؒ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کچھ دور لے جاکر ایک جگہ پر بیٹھادیا۔ بیٹھے بیٹھے ان صاحب کی پلکیں بوجھل ہوگئیں اور وہ وہیں لیٹ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ مکہ میں موجود ہیں اور حاجیوں کے ساتھ مناسکِ حج ادا کررہے ہیں۔ وہیں پڑے پڑے انہوں نے تمام مناسکِ حج ادا کرتے خود کو دیکھا۔ حج کا وقت ختم ہوا تو باباصاحبؒ وہاں پہنچے اور ان سے کہا۔ "کیا یہیں پڑا رہے گا؟"

ضعیف العمر صاحب کے پپوٹوں میں حرکت ہوئی اور وہ اٹھ کر مستانہ وار باباصاحبؒ کے ساتھ ہولئے۔ یہ ضعیف العمر مدراسی صاحب بعد میں نانا کے نام سے مشہور ہوئے اور آخر وقت تک تاج آباد میں رہے۔

اس کرامت کے اصول کو سمجھنے کے لئے ہمیں خواب اور بیداری کا مختصر جائزہ لینا ہوگا۔ ہم اپنی پوری زندگی دو حواس میں گزارتے ہیں۔ ایک خواب اور دوسرے بیداری۔ خواب اور بیداری، ہماری زندگی دو حالتوں میں سفر کرتی رہتی ہے۔ فرق صرف حواس اس کی نوعیت میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اللہ رات (خواب) کو داخل کرتاہے دن (بیداری) میں اور دن کو داخل کرتاہے رات میں۔ زندگی کو موت سے نکالتاہے اور موت کو زندگی سے نکالتاہے۔"

رات کے حواس میں مکانی اور زمانی فاصلے مردہ ہو جاتے ہیں لیکن دن کے حواس میں یہی فاصلے زندہ ہو جاتے ہیں۔

زید خواب دیکھتاہے کہ وہ اپنے ایک دوست سے باتیں کر رہاہے حالانکہ اس کا دوست دور دراز فاصلے پر رہتاہے۔ خواب میں زید کو یہ احساس بالکل نہیں ہوتا کہ اس کے اور دوست کے درمیان کوئی فصل ہے۔ ایسے خواب میں مکانی فاصلے صفر ہوتے ہیں۔ اس ہی طرح زید گھڑی دیکھ کر رات کے ایک بجے سوتا ہے ۔ خواب میں ایک ملک سے دوسرے ملک تک ہفتوں اور مہینوں کے فاصلہ کا سفر کرتاہے۔ راستے میں اور منزل پر قیام بھی کرتاہے۔ ایک طویل مدّت گزارنے کے بعد گھر واپس آتاہے۔ آنکھ کھلتے ہی گھڑی دیکھتاہے۔ اب بھی ایک ہی بجاہے۔ اس قسم کے خواب میں زمانی فاصلہ صفر ہوتاہے۔ رات کے حواس میں جو فاصلے مردہ ہو جاتے ہیں۔ وہی فاصلے دن کے حواس میں زندہ ہو جاتے ہیں۔

بیداری ہو یا خواب دونوں حالتوں میں ہمارے اعمال مشترک ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا کام ہے جو ہم بیداری میں کرتے ہوں اور خواب میں نہ کرتے ہوں ۔ فرق صرف حواس کی نوعیت کاہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم خواب کی حالت میں بے اختیار ہو جاتے ہیں اگر کسی طرح ہم خواب کے حواس کو استعمال کرنا سیکھ جائیں جیسا کہ ہم بیداری کے حواس کو استعمال کرنا جانتے ہیں تو ہم زمان و مکان سے آزاد ہو کر حسبِ منشاء کام انجام دے سکتے ہیں۔ انبیائے کرام کے اندر یہ صلاحیت بدرجۂ کمال موجود ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان

کے خواب اور بیداری میں فرق نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انبیاء سوتے ہیں لیکن ان کا قلب جاگتا رہتا ہے۔

جب حج کے متمنی شخص نے ضد کی تو باباصاحبؒ نے تصرف کے ذریعے اس کی بیداری کی حالت کو خواب میں منتقل کر دیا اور جسمِ خاکی کے ساتھ وہاں موجود نہ ہونے کے باوجود زمان ومکان سے آزاد ہو کر مناسکِ حج پورے کئے۔

ایک آدمی دو جسم:

مدراس کے رہنے والے ایک برہمن کسی آفس میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے آفس سے چار روز کی چھٹی لی اور باباتاج الدینؒ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ جب رخصت کی میعاد ختم ہونے لگی تو انہوں نے باباصاحبؒ سے واپسی کی اجازت چاہی لیکن باباصاحبؒ نے اجازت نہیں دی۔ ایک ہفتہ بعد دوبارہ اجازت مانگی تو بھی باباصاحبؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک ماہ بعد باباصاحبؒ نے اجازت دی تو یہ فکر وتردّد میں مبتلا گھر پہنچے کہ ایک ماہ کی غیر حاضری کی وجہ سے نہ جانے گھر والوں کا کیا حال ہوا اور آفس میں تو سخت سرزنش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گھر پہنچے تو نہ بیوی بچوں نے غیر معمولی جذبات کا اظہار کیا اور نہ ہی ایک ماہ کی غیر حاضری کو پوچھا۔ نہادھو کر سفر کی تکان اتری تو بیوی سے پوچھا کہ کیا دفتر کا کوئی آدمی مجھے پوچھنے آیا تھا۔ بیوی نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ دفتر کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا لیکن آپ اتنے پریشان کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ انہوں نے سارا حال کہہ سنایا۔ اور کہا کہ عجیب بات ہے کہ نہ تم میری ایک ماہ کی غیر حاضری کا پوچھتی ہو اور نہ دفتر والوں کو میری پرواہے۔ بیوی نے غیر یقینی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ آپ مذاق کیوں کرتے ہیں؟ دفتر کا وقت ہو گیا ہے۔ دفتر جایئے۔

دفتر میں بھی ہر شخص معمول کے مطابق پیش آتا رہا۔ کسی کا رویہ غیر معمولی نہیں تھا۔ یہ صاحب سخت حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو گئے اور عالمِ تصور میں باباصاحبؒ سے مخاطب ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کوئی مجھ سے غیر حاضری کو نہیں پوچھتا۔ ابھی وہ اس مخمصے میں مبتلا ہی تھے کہ چپراسی نے آکر کہا کہ صاحب نے وہ فائل منگوائی ہے جو دی تھی۔ فائل لے کر افسر کے پاس پہنچے اور کہا کہ میں تو ایک ماہ تک شکر درہ میں بابا تاج الدینؒ کے پاس ٹھہرا رہا لیکن یہاں آکر عجیب معاملے سے دوچار ہوں۔ نہ گھر والے میری غیر حاضری کو پوچھتے ہیں اور نہ دفتر والوں کو مجھ سے شکایت ہے۔ چپراسی کا کہنا ہے کہ یہ فائل کل آپ نے مجھ کو دی ہے حالانکہ میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں دفتر ہی نہیں آیا۔ افسر نے حیرت سے کہا۔ "آپ تو چار دن کی چھٹی کے بعد دفتر آگئے تھے اور اس عرصہ میں سارے دفتری امور پوری طرح انجام دیتے رہے ہیں۔"

شکر درہ اور مدراس دونوں جگہ کی حاضری کا ثبوت ملا تو برہمن صاحب کے علاوہ سارے دفتر والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

بڑے کھلاتے اچھے ہو جاتے:

اکثر ایسا ہوتا کہ بابا تاج الدینؒ جس گاؤں یا جس شہر میں رکتے، تو وہاں آپ کے اشارے پر بڑے بھجیئے تقسیم کئے جاتے اور وہاں موجود کوئی شخص ان کی قیمت بڑے والے کو ادا کر دیتا۔ ایک بڑھیا بہت بیمار ہوئی اور منت مانی کہ اگر میں صحت یاب ہو جاؤں تالوگس میں بڑے بٹواؤں گی۔ اس کو صحت نصیب ہوئی۔ وہ اپنے گاؤں سے باباصاحبؒ کی خدمت میں آئی اور بطور نیاز عمدہ اور وافر مقدار میں کھانا پکا کر لوگوں کو کھلایا۔ جب گھر واپس گئی تو دوبارہ بیمار ہو گئی۔ دوبارہ باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے عرض

کیا۔"حضور! میں نے منت مانی اور صحت یاب ہوئی لیکن اب پھر اسی بیماری نے پکڑ لیاہے۔"

باباصاحبؒ نے فوراًجواب دیا۔"لوگوں کو بڑے کھلاتے،اچھے ہو جاتے۔"

یہ سن کر بڑھیا کہ یاد آیا کہ اس نے بڑے بانٹنے کی منت مانی تھی۔ چنانچہ بڑھیا نے لوگوں کو بڑے کھلائے اوراس کو دوبارہ صحت حاصل ہو گئی۔

معذور لڑکی:

راجہ رگھو جی راؤ کے ملازم منشی نور علی صاحب کا بیان ہے کہ رات آٹھ بجے کے قریب عیسیٰ خاں صاحب کھانا لے کر باباصاحبؒ کی خدمت میں آئے اور باباصاحبؒ سے اصرار کیا کہ کھانا کھالیں۔ باباصاحبؒ نے جواب دیا۔"ٹھیر رے! میرا مہمان آیاہے۔اس سے مل لوں،تب کھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر باباصاحبؒ اٹھے قیام گاہ سے نکل کر روانہ ہوئے۔ صدر دروازے سے نکل کر آگے بڑھے اور پُل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت پل کی طرف آتی نظر آئی۔ یہ عورت جھانسی کی رہنے والی تھی اور اس نے اپنی لڑکی کو اٹھار کھا تھا جو ہاتھ پیروں سے معذور تھی۔اس نے لڑکی کو باباصاحبؒ کے قدموں میں ڈال دیا۔ باباصاحبؒ اٹھے اور لڑکی کے دوپٹے کو پکڑ کر حکم دیا۔"اٹھو!"لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیٹھی رہی۔دوسری بار باباصاحبؒ نے ڈانٹ کر فرمایا۔"اٹھو!"لڑکی نے خوفزدہ ہو کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ گر پڑی۔ تیسری بار جلال اور تحکم کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔"اٹھ ری!"لڑکی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باباصاحبؒ یہ کہتے ہوئے اپنی قیام گاہ کی

طرف بڑھے "میرے پیچھے میرے ساتھ چل۔" وہ لڑکی اپنے پیروں پر قیام گاہ تک گئی۔ کچھ دن تک وہ لڑکی شکر درہ میں رہی اور مکمل صحت یاب ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔

کالے اور لال منہ کے بندر:

باباتاج الدینؒ کے فیض یافتہ حضرت محمد عبدالعزیز عرف نانا میاں صاحب کا کہنا ہے کہ میرے ایک دوست جو پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھے، باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باباصاحبؒ نے ان سے کہا۔ "کالے منہ کے بندر لال منہ کے بندر ہوتے۔" یہ بات میرے دوست کو بری لگی اور دل میں سوچا کہ عجیب آدمی ہیں کہ مجھے کالے منہ اور لال منہ کے بندر کہہ رہے ہیں۔ ضرور مخبوط الحواس ہیں جنہیں لوگوں بر گزیدہ ہستی کا درجہ دے دیا ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل صاحب جب اپنے وطن رائے پور پہنچے تو وہاں کے ڈی ایس پی نے ان کو اپنا پی اے مقرر کر دیا۔ اور کچھ دنوں بعد سب انسپکٹر کی ٹریننگ کے لئے ساگر بھیج دیا۔ جب یہ مجھ سے ملنے آئے تو سب انسپکٹر کی وردی ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ باباصاحبؒ کا کہنا بالکل سچ نکلا۔ کالے منہ کے بندر لال منہ کے بندر ہونے کا مطلب میری ترقی کی طرف اشارہ تھا۔ یہ سن کر مجھے (راوی کو) بھی باباصاحبؒ کی ذات پر کشش محسوس ہوئی اور میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

سونا بنانے کا نسخہ:

عبدالرّزاق صاحب کا بیان ہے کہ میرے ماموں کو سونا گری کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اور انہوں نے اس کام پر سینکڑوں روپئے برباد کر دیئے تھے۔ ایک دفعہ کسی صاحبِ کمال سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ دو سو برس پرانے مکانوں کی دیواروں پر

ایک خود دو بوٹی اُگ آتی ہے۔اس بوٹی کی پہچان یہ ہے کہ اس سے شنجرف کا کشتہ باوزن ہو جاتا ہے۔ جو کہ تانبے کو رنگتا ہے۔ ماموں صاحب اپنے گاؤں سے ناگپور آئے اور ایک پرانے اور بوسیدہ مکان سے مطلوبہ بوٹی کو حاصل کر لیا۔ بوٹی حاصل کرنے کے بعد سوچا کہ پہلے باباتاج الدینؒ کے پاس حاضری دینی چاہیئے۔اور ان کی دعا کے بعد بھٹی لگانی چاہئے تاکہ کامیابی نصیب ہو۔ شکر درہ صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ باباصاحبؒ تانگے پر سوار جارہے ہیں۔ باباصاحبؒ کے گلے میں پھولوں کا ایک گجرا تھا۔اس میں تلسی کے پتے بھی لگے ہوئے تھے۔ باباصاحبؒ نے اس گجرے میں سے تلسی کا ایک پتہ نکال کر ماموں صاحب کو دے دیا۔انہوں نے برکت کے لئے بوٹی کے مصالحے میں تلسی کا پتہ بھی شامل کر دیا۔ اس مصالحے کو آزمایا تو شنجرف کا کشتہ ہم وزن تیار ہو گیا۔ اس یقینی آزمائش کے بعد اس بوٹی اور تلسی کے پتے کے سفوف کو تانبے پر استعمال کیا تو سونا تیار ہو گیا جسے بازار میں فروخت کر دیا۔اس کے بعد ماموں صاحب نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن بوٹی سے سونا تیار نہیں ہوا جس سے پہلے تیار ہو گیا تھااور نہ پھر کبھی باباصاحبؒ نے انہیں کو تلسی وغیرہ کا پتہ دیا۔

درشن دیوتا:

حضرت باباتاج الدینؒ سے ہر مذہب و ملت اور ہر عقیدہ کے لوگوں نے فیض پایا۔ ان کے فیض کا دریا بنجر وخشک اور زرخیز زمین دونوں کسی امتیاز کے بغیر سیراب کرتا تھا۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق باباؒ کی نظرِ کرم سے مستفیض ہوتا تھا۔

جناب بہادر پرشاد صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک سادھو سے ملاقات کے دوران حضور مہاراج باباصاحبؒ کا ذکر آگیا تو انہوں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "ہم

ہندوؤں کے لوگ میں کس چیز کی کمی ہے جو ایک مسلمان فقیر کے والہ وشیدا ہو رہے ہو؟"

میں نے ان سے کہا کہ آپ بابا صاحبؒ کی خدمت میں ایک بار حاضر ہو کر تو دیکھئے۔ چنانچہ میں سادھو صاحب کو لے کر شکردرہ حاضر ہوا۔ بابا صاحبؒ کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ ہم دور کھڑے ہو کر محل کی طرف ٹکٹکی باندھ کر درشن کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے یکایک دیکھا کہ ہم جس جگہ کھڑے ہیں وہاں نہ کوئی محل ہے نہ آشرم۔ ہم کبھی ندی کے کنارے شنکر جی کا درشن کرتے ہیں۔ کبھی رام چندر جی کو دیکھتے ہیں۔اور کبھی خود کو کرشن جی کے پاس دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک لمحے میں سارے اوتاروں کے درشن کر لئے۔اتنے میں لوگوں کی آوازیں گونج اٹھیں اور ہم نے دیکھا کہ ہم شکردرہ کے محل کے سامنے کھڑے ہیں اور سامنے باباصاحبؒ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم دونوں بے اختیار باباصاحب کے قدموں میں گر پڑے۔اور اس کے بعد جو کچھ گزری وہ پربھو ہی جانتے ہیں۔

اسی طرح ایک دفعہ تین سادھوؤں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار باباصاحبؒ سے متعلق کیا۔ میں جب ان سے ملاقات کر کے واپس گھر آیا اور رات کو سویا تو حالتِ خواب میں دیکھا کہ باباصاحبؒ میرے گھر تشریف لائے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی بیوی سے کہا کہ اٹھو، فوراً چائے بناؤ۔ دیکھتی نہیں ہو کہ آج باباصاحبؒ نے ہمارے گھر تشریف لا کر ہمیں کتنی عزت بخشی ہے! میری بیوی نے چائے بنا کر پیش کی۔ باباصاحبؒ نے چائے پی اور فرمایا۔"چل رے تیرے کو تیرتھ کرالاؤں۔"

باباصاحبؒ کے ساتھ میں گھر سے باہر نکلا تو انہوں نے فرمایا۔" ان تینوں سادھوؤں کو بھی ساتھ لے لو۔"

چنانچہ میں نے ان سادھوؤں کو بھی ساتھ لے لیا۔ آگے آگے باباصاحبؒ تھے، درمیان میں سادھو اور پیچھے ہیں۔ لمحے بھر میں ہم بنارس پہنچ گئے اور درشن کے بعد گیا جی پہنچ کر وہاں بھی درشن کئے۔ باباصاحبؒ نے فرمایا "چلو جگن ناتھ جی کا بھی درشن کر لیں۔"

ہم لوگ جگن ناتھ جی پہنچے اور درشن سے فارغ ہو کر بازار میں آئے۔ ایک سادھو نے مجھ سے کہا۔ "جگن ناتھ جی کی نشانی ایک لوٹا لادو۔"

میں نے ایک دوکان پر لوٹے کی قیمت پوچھی تو دوکاندار نے تین یا چار روپئے بتائی۔ میں نے دوکان دار سے مناسب قیمت دریافت کی تو اس نے کہا یہی مناسب قیمت ہے۔ میں نے فوراً قیمت ادا کی اور لوٹا لے کر سادھوؤں کے حوالے کر دیا۔

شام کو جب سادھوؤں کے استھان پہنچا تو وہ لوگ وہاں موجود نہیں تھے۔ میں شکردرہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ باباصاحبؒ کی زیارت کروں۔ میں وہاں محل کے صدر دروازے کے قریب ان تینوں سادھوؤں میں سے ایک کو بیٹھے دیکھا ایک طرف وہی لوٹا رکھا ہوا تھا جو میں نے جگن ناتھ جی سے خرید کر ان کو دیا تھا۔ میں یہ لوٹا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ جگن ناتھ جی کی زیارت اور لوٹا خریدنے کا واقعہ عالمِ بیداری میں ہوا یا خواب میں۔ میں نے سادھو سے پوچھا۔ "آپ یہاں کس لئے آئے ہیں اور یہ لوٹا کہاں سے لائے ہو؟"

سادھو نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بہت جلد بھول گئے آپ، یہ وہی لوٹا تو ہے جو آپ نے جگن ناتھ جی میں دلایا تھا۔ میں بھی باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تاکہ ان سے مکتی (نجات) کا مارگ حاصل کروں۔"

سادھو کے منہ سے اتنا سننا تھا کہ میں بے خود ہو کر محل کے اندر داخل ہو گیا۔
میں نے دیکھا کہ باباصاحبؒ میری طرف تشریف لارہے ہیں۔قریب آکر فرمایا۔"بڑے ساہوکار کے بیٹے! ڈھائی روپۓ کے لوٹے کے اتنے دام دے دیئے۔"
میں بے تاب ہو کر باباصاحبؒ کے چرنوں میں گرپڑا۔

تحصیلدار:

مہاراجہ قرولی اور تحصیلدار درگاپرشاد کے گرد خود کو حضرت باباتاج الدینؒ کا واس کہتے تھے۔انہوں نے اپنی پوتھی میں باباصاحبؒ کا فوٹو رکھا ہوا تھا۔اکثر پوتھی کھول کر فوٹو دیکھا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نہ مشرک ہیں اور نہ بت پرست۔ ہمیں باباصاحبؒ نے اللہ اللہ کرنے کا حکم دیا ہے۔بس رات دن ہمارا یہی شغل ہے۔
مہاراجہ قرولی کے گرو سادھو صاحب بیان کرتے تھے۔"میں برہمن ہوں۔ ایم اے اور ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد ناگپور میں تحصیلدار مقرر ہوا۔ مجھے اپنی بیوی سے شدید محبت تھی۔اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے سخت صدمہ پہنچا۔لوگوں نے اصرار کیا کہ میں دوسری شادی کرلوں۔پہلے تو میں نہیں مانا لیکن بعد میں سوچا کہ جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ شادی کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ شادی نہیں کروں گا۔پنڈتوں کی بات سے مجھے قطعی اطمینان نہیں تھا۔اس زمانے میں ناگپور کے بچے بچے کی زبان پر باباتاج الدینؒ کا نام تھا۔ میں ان ہندوؤں کو برا سمجھتا تھا جو مسلمان فقیروں کے پاس جاتے تھے۔ پھر بھی میرے دل نے کہا چلو، حاضر ہو کر دیکھ لیا جائے۔زبان سے کچھ نہیں کہوں گا، اگر کامل ہیں تو خود جواب دیں گے۔

میں نے ایک ٹوکرا کیلا خریداا اور باباصاحبؒ کے دربار میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی میرا ان کا سامنا ہوا۔ باباصاحبؒ نے فرمایا۔"آیئے تحصیلدار صاحب! تاج الدین نے بیوی نہیں کی۔آپ بیوی کر کے کیا کریں گے۔"پھر فرمایا"لاؤ کیلا کھلاؤ۔"

میں نے کیلا چھیل کر پیش کیا۔ باباصاحبؒ نے تھوڑا سا کھانے کے بعد میری طرف بڑھادیا اور کہا۔"کھاجاؤ۔"

میں برہمن زادہ، چھوت چھات کا سختی سے پابند۔ پھر بھی ایک مسلمان کا جھوٹا کیلا کس طرح کھا گیا، مجھے یاد نہیں۔ کیلا کھاتے ہیں جذب طاری ہو گیا اور ہوش وحواس ختم ہو گیا۔

گھر والوں کو خبر ہوئی تو پکڑ کر لے گئے۔ گرم لوہے سے جسم کو داغا لیکن میری حالت وہی رہی اور میں بدستور جذب ومستی میں ڈوبا رہا۔ آخر کار مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ اس کو وہیں لے جایا جائے جہاں سے یہ بیماری لگی ہے۔ میری برادری کو یہ قطعی منظور نہیں تھا کہ ایک برہمن کسی مسلمان کے پاس جائے لیکن مجبوری نے بالآخرا نہیں آمادہ کر اہی لیا۔

باباصاحبؒ کے دربار پہنچتے ہی حکم ہوا۔"زنجیریں کھول دی جائیں۔ یہ اچھا ہے۔"میں اسی وقت ہوش میں آگیا۔

باباصاحبؒ نے فرمایا۔"اب تم تحصیلدار نہیں رہے۔"

لوگوں نے کہا۔"حضور! دیوانگی کی وجہ سے یہ نوکری پر نہ جاسکے۔اس لئے ان کی نوکری ختم ہو گئی ہے۔"

باباصاحب نے ایک سادے کاغذ پر اپنے دستِ مبارک سے اپنا نام لکھ کر مجھے دیا اور فرمایا:لو یہ فرمان! تحصیلدار تمہارے جوتے اٹھائیں گے۔اللہ اللہ کرتے رہو۔"

حضور باباصاحبؒ کا فرمان پورا ہوا۔ تحصیلدار درگاپرشاد اور مہاراجہ قرولی جیسے لوگ میرے جوتے اٹھانے میں فخر سمجھتے ہیں۔

محبوب کا دیدار:

اجمیر شریف میں ایک صاحب جذب و مستی کے عالم میں دکھائی دیتے تھے۔ کھانے پینے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔ لوگ انہیں چائے پلاتے مگر بہت تھوڑی سی مقدار حلق میں جاتی تھی۔ باقی گر جاتی تھی۔ ان صاحب کو باباتاج الدینؒ کی ذات بابرکات سے فیض ہوا تھا۔ انہوں نے لندن جاکر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی اور وہاں سے بمبئی آکر پریکٹس کا ارادہ کیا۔ آفس کے لئے فرنیچر اور دیگر ضروری سامان کی خریداری کے لئے بازار گئے اور خریداری کرنے کے بعد باربرداری کا انتظام کرنے لگے۔ ان دوران سامنے عمارت کی کھڑکی کھلی اور ایک رخ زیبا پر نظر پڑی۔ نہ جانے کیا دیکھا مبہوت ہو کر رہ گئے۔ کھڑکی بند ہو جانے کے بعد بھی ان کی نگاہیں اسی طرف مرکوز رہیں۔

صبح سے دوپہر کا وقت ہوا اور شام قریب آنے لگی لیکن وہ بے خودی اور وارفتگی کے عالم میں دیدارِ محبوب کی تمنا کے ساتھ وہیں کھڑے رہے۔ شام کے وقت اسی عمارت سے ایک جنازہ باہر نکلا۔ ان کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ ان کی دنیا لٹ چکی ہے۔ اب وہ اپنے محبوب کے حسین سراپا کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

جنازے کے ساتھ ساتھ وہ بھی چلتے رہے اور قبرستان پہنچ گئے۔ جب سب لوگ لاش کو سپردِ خاک کر کے واپس چلے گئے تو وہ بے تاب ہو کر قبر سے لپٹ گئے اور زاروقطار رونے لگے۔ آنسوؤں کی جھڑی کسی طرح رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ روتے

روتے سورج غروب ہو گیا اور اندھیرا چھا گیا۔ اسی حالت میں دیکھا کہ ایک بزرگ کھڑے فرمارہے ہیں۔ "ناگپور آ کر ہم سے ملو، ہم تاج الدین ہیں۔"

بزرگ کا لہجہ اس قدر پر تاثر تھا کہ محبوب کے مزار کا طواف کرنے کا ارادہ ناگپور جانے کی شدید خواہش میں بدل گیا۔

ناگپور پہنچے تو باباصاحبؒ شکر درہ محل کے چبوترے پر رونق افروز تھے۔ انہوں نے باباصاحبؒ کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ باباصاحبؒ کی جگہ ان کا محبوب بصد ناز و ادا مسند نشیں ہے۔ وہ اس جلوے کی تاب نہ لا کر عالمِ سرمستی میں دوڑے اور محبوب کے قدموں میں جا پڑے۔ لمحے بھر میں باباصاحبؒ کی نگاہِ فیض سے کتنے ہی اسرار و رموز ان پر منکشف ہو گئے۔ ہوش آیا تو باباصاحبؒ نے فرمایا۔

"جاؤ! اجمیر شریف کی خدمت تمہارے سر ہے۔ ہر جگہ ہمیں دیکھتے رہو۔ اچھے رہو گے۔"

پانچ جوتے:

ایک روز حضرت باباتاج الدینؒ اولیاء کی خدمت میں ایک ضعیف العمر عالم حاضر ہوئے۔ باباصاحبؒ نے انہیں دیکھ کر فرمایا۔ "حضرت !ان کو پانچ جوتے لگاتے ہیں۔"

وہاں موجود تمام لوگ حیران رہ گئے۔ لیکن عالم صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خدا کے لئے باباصاحبؒ کے حکم کی تعمیل کرو۔ "ایک خادم آہستہ آہستہ پانچ جوتے ان کی پشت پر مار دیئے۔ عالم صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی

تو لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ انہوں نے کہا جو راستہ ساری عمر طے نہ ہو سکا وہ آنِ واحد میں طے ہو گیا۔

بیگم صاحبہ بھوپال:

ایک دفعہ بیگم صاحبہ بھوپال نے نہایت اہتمام کے ساتھ اعلیٰ درجے کا کھانا تیار کرایا۔ کھانا تیار کراتے وقت ان کے منہ سے نکلا کہ ایسا کھانا باباصاحبؒ کو کون کھلاتا ہو گا۔ جب وہ کھانا تھالوں میں سجا کر خواصوں کے سر پر رکھ کر حاضرِ خدمت ہوئیں تو باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "یہ کھانا ہمارے کام کا نہیں ہے۔ ہمیں ایسا کھانا کون کھلا سکتا ہے۔"

بیگم صاحبہ بہت نادم ہوئیں۔

فاتحہ پڑھو:

یوسف حسین خاں، ناظمِ ریاست جے پور دربار تاج اولیاء میں اپنے والد کی صحت یابی کی دعا کے لئے حاضر ہوئے۔ باباصاحبؒ نے انہیں دیکھتے ہی ان کے شانوں پر پڑی ہوئی شال اتار لی اور زمین پر بچھاتے ہوئے فرمایا۔ "فاتحہ پڑھو حضرت، فاتحہ۔" اس کے ساتھ ہی باباصاحبؒ نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ یوسف حسین خاں صاحب نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے اور حاضرین نے بھی۔ فاتحہ کے بعد ناظم صاحب حکیم ظفر جے پوری کے گھر پہنچے تو وہاں تار کے ذریعے خبر آچکی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ جے پور پہنچ کر معلوم ہوا کہ جس وقت باباصاحبؒ نے ناگپور میں ان کے والد کی فاتحہ پڑھی تھی اسی وقت جے پور میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی جا رہی تھی۔

:ABDUS SAMAD SUSPENDED

بھیکی پور جائس کے بعد الصمد صاحب دل میں یہ خواہش لئے ہوئے باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ انہیں کشف عطاہو جائے۔ باباصاحبؒ کے روبرو پہنچے تو آپ بیڑی پی رہے تھے۔ باباصاحبؒ نے سلگتی ہوئی بیڑی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"یہ لو کشف!"

عبدالصمد صاحب نے فوراًبیڑی لے کر گہرا کش لگایا۔ قوتِ کشف انگڑائی لے کر اٹھی اور لمحہ بھر میں عبدالصمد صاحب نے اپنے اندر مخفی صلاحیتوں کا بے پناہ ذخیرہ محسوس کیا۔ باباصاحبؒ نے بہت سے شہروں کے نام تیزی سے لئے اور فرمایا"جاؤ! ان مقامات پر ہر مرض میں تمہارے پانی سے شفاہوتی ہے۔"

عبدالصمد صاحب اپنی مطلوبہ دولت لئے ہوئے واپس ہوئے۔ لوگ اتنی کثرت سے ان کے پاس آنے لگے کہ حکومت کو ریلوے اسٹیشن اور پولس اسٹیشن کی تعمیر کرانی پڑی وہ جس پانی میں ہاتھ ڈالتے، وہ جاں بلب مریض کو بھی بیماری کے منہ سے کھینچ لاتا۔ عبدالصمد صاحب کی شہرت ہندوستان سے نکل کر یورپ تک جاپہنچی۔

ایک دن ایک عورت ان کے پاس حاضر ہوئی۔ یہ زمانہ اس کے مخصوص ایام کا تھا۔ عبدالصمد صاحب نے ازراہِ کشف کہا۔"ناپاک ہے، نکال دو۔"

عورت پریشان حال شکستہ دل ناگپور پہنچی۔ اور شکر درہ سے باہر مولسری کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ پچھلے تجربے کی بناپر وہ حاضرِ دربار ہونے سے ڈر رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف اس کے بیٹے کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

ادھر باباصاحبؒ نے فرمایا۔"جاؤ مولسری کے نیچے وہ بیٹھی ہے، بلالاؤ۔"

ایک عقیدت مند گیااور اس کو بلالایا۔ عورت کچھ فاصلے پر ہی کھڑی ہو گئی اور قریب آنے سے ہچکچانے لگی۔ باباصاحبؒ نے فرمایا"قریب آؤاماں! عبدالصمد ایک لٹیا پانی تھا گندا ہو گیا۔تاج الدین سمندر ہے۔ یہاں آؤاماں!"

عورت فوراً قدم بوس ہو گئی۔

باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "گھر جاتے ہی، بچہ کھیلتا ملتاہے، اچھار ہتاہے۔"

ادھر عورت بامراد واپس ہوئی، ادھر باباصاحبؒ نے جائس کی طرف منہ کر کے فرمایا۔"ABDUS SAMAD SUSPENDED"(عبدالصمد کو معطل کیا گیا)۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی عبدالصمد صاحب کی ساری صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔

بدیسی مال:

علی حسین صاحب ناگ پور کے تحصیل دار تھے وہ ایک انگریز عورت کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔اور اسے شادی کرنے پر رضامند کر لیا۔ عورت کی شرائط یہ تھیں: کہ بنگلہ اس کے نام رجسٹری کر دیا جائے۔ اور تمام روپیہ بینک میں اس کے نام منتقل کر دیا جائے۔ علی حسین صاحب کو یہ تمام شرائط دل و جان سے قبول تھیں۔ لیکن وہ سوچتے تھے کہ انگریزوں کی حکومت ہے کہیں انگریز عورت سے شادی خطرے کا باعث نہ بن جائے چناں چہ انھوں نے ارادہ کیا کہ باباصاحب سے دعا کرائی جائے تاکہ خطرہ ٹل جائے۔

باباصاحب کی خدمت میں شکر درہ پہنچے اور زائرین کے ہجوم میں ایک طرف کھڑے ہو گئے دفعتہ باباصاحب ان سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ گھڑی دکھاؤ!

علی حسین صاحب نے ہاتھ سے گھڑی اتار کر پیش کی۔ باباصاحب نے فرمایا کہ "حضرت! بدیسی مال اچھا نہیں ہوتا۔"

علی حسین صاحب سمجھ گئے کہ یہ شادی ان کے لیے اچھی نہیں ہے۔ لیکن انگریز عورت کی محبت بری طرح ذہن پر سوار تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو فریب دیتے ہوئے کہا کہ اس وقت پورے ملک میں غیر ملکی مال کا بائیکاٹ ہے باباصاحب نے اسی کے متعلق مجھ سے کہا ہے شادی کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔

علی حسین صاحب نے انگریز عورت سے شادی کرلی۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ اختلافات رونما ہونے شروع ہوگئے اور نوبت تلخ کلامی تک پہنچ گئی۔ علی حسین صاحب نے ایک دن غصے میں آکر اپنی بیوی کو ایک طمانچہ رسید کردیا۔ بیوی نے مقدمہ کر دیا۔ حکمراں قوم کے ایک فرد کو طمانچہ مارنا پوری قوم کی توہین تھی۔

علی حسین صاحب پہلے ہی اپنا تمام اثاثہ بیوی پر نثار کر چکے تھے۔ ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور اب ہر وقت قید وبند کا خدشہ دماغ پر مسلط رہنے لگا۔ ناچار دوبارہ باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قدم بوسی کرنی چاہی۔ باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "نکو قدم بوسی (قدم بوسی نہیں) پہلے یہ بتاؤ ہم نے جیل کس لئے بنایا ہے؟"

علی حسین سمجھ گئے تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ انہیں اپنے طرزِ عمل پر بہت افسوس ہوا کہ باباصاحبؒ کے صریح حکم کو انہوں نے غلط معنی پہنا کر خلاف ورزی کی۔ چنانچہ وہی ہوا جس کی طرف باباصاحبؒ نے اشارہ فرمایا تھا۔ علی حسین صاحب کو قید کی سزا سنادی گئی۔

آدھا دیوان:

ایک مرتبہ یوسف خاں صاحب حضرت باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا۔ "جاؤ، تم کو آدھا دیوان کیا۔"

اس زمانے میں دیوان کا عہدہ ریاست میں صرف ایک تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آدھے دیوان سے کیا مراد ہے۔ کچھ عرصے بعد ریاست کو دو ضلعوں میں تقسیم کر کے دیوان اضلاعِ شرقی اور دیوانِ اضلاع غربی دو عہدے قائم کئے گئے اور ایک دیوان کی جگہ دو دیوان مقرر کئے گئے جن میں سے ایک یوسف حسین خاں بھی تھے۔

کیوں دوڑتے ہو حضرت:

حسام الدین صاحب بیان کرتے تھے کہ باباصاحبؒ کی شہرت سن کر میں نے ارادہ کیا کہ میں آپ کا مرید ہو جاؤں۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ باباصاحبؒ ایک حوض پر وضو کر رہے ہیں۔ اس پانی کا عجیب تاثیر ہے کہ اس سے اعضا آئینہ کی طرح شفا ہو جاتے ہیں۔ وضو کرنے کے بعد صاحبؒ نے مجھ سے کہا تم بھی وضو کر لو۔ میں نے بھی وضو کیا اور میرے اعضاء بھی آئینہ کی طرح چمکنے لگے۔ اس کے بعد باباصاحبؒ نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے آپکا دستِ مبارک تھام لیا اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ میرے مرید ہونے کے خیال کی منظوری باباصاحبؒ کے ہاں سے ہو گئی ہے۔ اس لئے اب حاضر ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ دفتر سے چھٹی لی اور مرید ہونے کے خیال سے ناگپور پہنچا۔ شکردرہ میں باباصاحب کی سواری نمودار ہوئی۔ آپ تانگہ میں سوار تھے اور لوگوں کا ایک ہجوم پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نوجوانی کی

وجہ سے دوڑ میں سب سے آگے نکل کر جوں ہی تانگے کے قریب گیا، باباصاحبؒ نے فرمایا۔"کیوں دوڑتے ہو حضرت، خواب میں ہاتھ ملایاہے وہ بس ہے۔"

دال بھات:

متھراپرشادامراؤتی والے کہتے تھے۔باباصاحبؒ کی غلامی پر پہلے بھی بہت سے ہندو بھائی مجھے طعنے دیتے تھے۔میرے گھر والے کہتے تھے کہ تیرادھرم بھرشٹ ہو گیا۔ میری بیوی نے مجھ سے کہا۔"تم نے اپنادھرم تو خراب کر ہی لیا۔اب دنیا بھی خراب ہونے والی ہے۔ایک بیٹی ہے وہ بھی صبح وشام میں بیوہ ہونے والی ہے۔آخر تمہارے بابا کس دن کام آئیں گے؟ تم ان کی بڑی کرامتیں بیان کرتے رہتے ہو۔اپنے داماد کو تو موت سے بچاؤ۔"

بیوی کی بات تیر کی طرح میرے دل میں لگی۔میں نے کہااس کو بس میں رکھ کر ناگپور لے چلو۔ڈاکٹروں نے کہایہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے، اگر مارنے کی جلدی ہے تو ضرور لے جاؤ۔دوسرے لوگوں نے بھی بہت سمجھایالیکن میں نہیں مانا۔میں نے ان سے کہہ دیا کہ اسے باباصاحب سے ٹھیک کراکے دم لوں گا۔ورنہ پھر تمہیں اپنی شکلیں نہیں دکھاؤں گا۔"

مختصر یہ کہ میرے گھر والوں نے میرے داماد کو بستر پر ڈال کر بس میں لٹادیا اور ڈاکٹر کو ساتھ لے کر شکر درہ پہنچے۔میں بس سے اتر کر سیدھا باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوااور جاتے ہی عرض کیا۔"بابا! میں اپنے داماد کو ساتھ لایا ہوں جو چند لمحوں کا مہمان ہے۔یاتو یہ اچھاہو جائے ورنہ آپ کا منہ یہاں بھی کالا، وہاں بھی کالا۔"

میری یہ گستاخانہ بات سن کر باباصاحبؒ نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑااور دوسراہاتھ مجھے مارنے کے لئے اٹھایااور فرمایا۔"کیا کہا؟"

میں نے کہا۔"باباچاہے مارو،چاہے چھوڑو۔بات یہی ہے جو میں نے کہی ہے۔ میری عزت وآبرو آپ کے ہاتھ میں ہے۔" باباصاحبؒ نے ہاتھ جھٹک کر فرمایا۔"جا، دال بھات کھلا،اچھاہو جاتاہے۔"

میں واپس بھاگا اور دال بھات تیار کرکے اس کو کھلایا۔ تمام لوگ میری اس حرکت کو دیوانہ پن سمجھ رہے تھے کیوں کہ پیچش کے مریض کو آخری اسٹیج پر جب کہ پانی بھی ہضم نہیں ہوتا۔دال بھات کھلانا کوئی عقل مندی کی بات نہیں تھی۔داماد دال بھات کھاتے ہی سو گیا۔شام کو جاگا اور دوبارہ دال بھات مانگا۔اور کھاکر پھر رات بھر سویارہا۔ اگلے دن وہ بالکل تندرست ہو گیا۔اور اپنے پیروں سے چل کر باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اٹیک،فائر:

فرید صاحب فضاؔ نے بیان کیاکہ تقریباً۱۹۰۹ء کے ابتدائی زمانے میں باباصاحب واکی شریف میں مقیم تھے۔میں پروفیسر محمد عبدالقوی لکھنوی کے ساتھ باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے پہنچا۔ پتہ چلا کہ صاحبؒ واکی شریف سے سات آٹھ میل دور جنگل میں تشریف فرماہیں۔ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ باباصاحبؒ ایک کھیت میں تشریف رکھتے ہیں۔چاروں طرف ببول کے درخت ہیں جس کے سائے میں حاضرین بیٹھے ہوئے ہیں۔اس وقت باباصاحبؒ کھیت میں پتھر چن چن کر ڈھیر بنا

رہے تھے۔ ہم دونوں بھی سلام کر کے اسی کام میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ دو ڈھائی فٹ اونچا ڈھیر تیار ہو گیا۔ باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "اب دوسرا ڈھیر بتاؤ اور جلدی بناؤ۔"

ہم لوگوں نے جلدی سے دوسرا ڈھیر تیار کر دیا۔ اب باباصاحبؒ نے ایک لکڑی ہاتھ میں لے کر فوجی احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے۔ "فلاں ڈویژن اِدھر مارچ کرو، فلاں ڈویژن اُدھر جاؤ۔ اٹیک فائر!"

باباصاحب ایک خاص کیفیت میں یہ احکامات جاری کرتے رہے اور پھر فرمایا "یونانی بھاگے، پکڑو، پکڑو۔"

پھر فرمایا۔ "ہم نے یونانیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ اب کبھی مقابلے پر کھڑے نہ ہوں گے۔"

باباصاحبؒ نے ہاتھ کی لکڑی پتھروں کے ڈھیر میں نصب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ترکی کی فتح کا جھنڈا ہے۔"

دو تین روز بعد اخبارات میں یہ خبر آئی کہ جنگ بلقان میں ترکوں نے یونانیوں کو بری طرح شکست دے دی اور ان کے ہاتھ کثیر مالِ غنیمت آیا ہے۔

جنگِ عظیم اول کے واقعات و حالات باباصاحبؒ اس طرح بیان کرتے تھے گویا آپ خود جنگ میں شریک ہوں۔ لوگ ان واقعات کو نوٹ کر لیتے اور چند روز بعد اس کی تصدیق ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ باباصاحبؒ نے غصے میں پتھر اٹھا کر ایک مکان کو مارا اور کہا۔ "بڑا آیا اینٹورپ، فتح نہیں ہوتا۔"

لوگوں نے وقت نوٹ کر لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی وقت انیٹورپ پر ایک بم گرا اور وہ فتح ہو گیا۔

علی بردران اور گاندھی جی:

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ناگپور آئے۔ تو باباصاحبؒ کے پاس حاضر ہونے کے بجائے۔ راجہ رگھوجی راؤ کو لکھا کہ باباصاحبؒ سے ملنے کا وقت مقرر کردیں۔ راجہ صاحب پریشان ہوگئے کہ کون ساوقت دیں۔ باباصاحبؒ کے کوئی اوقات مخصوص نہیں تھے۔ لوگ ہر وقت حاضر ہوتے اورنہ ہی باباصاحبؒ کسی کو وقت دیتے تھے۔ باباصاحبؒ نے خود ہی راجہ صاحب سے کہا۔ "ان سے کہو جمعہ کے دن چار بجے ہمارے ساتھ چائے۔ پئیں۔ راجہ صاحب نے علی برادران کو مطلع کردیا۔ جمعہ کے دن ٹھیک چار بجے حضور باباصاحبؒ کمرے سے باہر تشریف لائے، چائے طلب کی اور حکم دیا کہ حاضرین کو چائے پلائی جائے۔ علی برادران وقت پر نہ پہنچ سکے۔ سب نے چائے پی اور پانچ بجے باباصاحبؒ نے سواری طلب کی اور شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں علی برادران کی موٹر آتی ہوئی نظر آئی۔ کوچوان نے گاڑی روک دی۔ علی برادران نے کار سے اتر کر سلام عرض کیا۔

باباصاحبؒ نے کوچوان سے کہا۔ "کیوں رے، ان کو ہار دے دوں؟"

اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "ہاں بابا، دے دو۔"

باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "میں کیا دوں گا۔ تو ہی دے دے۔" ہیرا کوچوان نے کچھ ہار اٹھ کر علی برادران کو دے دیئے۔

باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "جاؤ پھاٹک دیکھو۔"

اس کے ساتھ ہی باباصاحبؒ کی سواری شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ علی برادران باباصاحبؒ کے ارشاد کا مطلب کچھ بھی نہیں سمجھے۔

اسی وقت ناگپور میں کانگریس کا جلسہ ہونے والا تھا اور علی برادران خلافت کے سلسلے میں جلسہ کرنے والے تھے۔ گاندھی جی بھی آئے ہوئے تھے۔ باباصاحبؒ کی آمد کا شور سنا تو سب سڑک پر آ گئے۔ اور سلام عرض کیا۔ باباصاحبؒ نے فرمایا۔ "جاؤ، آٹھ سو کوّے اڑا دیئے۔"

گاندھی جی اس ارشاد کو کوئی معنی نہ پہنا سکے۔ رات کو جلسہ ہوا تو آٹھ سو ممبران کٹ کر گاندھی جی کی طرف آ گئے۔ اس وقت گاندھی جی کو باباصاحبؒ کے ارشاد کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔ ایک زمانہ میں گاندھی جی روانہ باباصاحبؒ کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے۔ باباصاحبؒ ان کو ڈانٹتے لیکن وہ پروا نہیں کرتے۔ اور پابندی سے حاضر ہوتے تھے۔

علی برادرانِ خلافت کے جلسوں میں تقریر کے بعد بمبئی پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ جب وہ جیل کے دروازے سے اندر داخل ہونے لگے تو باباصاحبؒ کا ارشاد یاد آیا کہ "جاؤ پھاٹک دیکھو۔"

بے تیغ سپاہی:

نواب صدیق علی خاں صاحب تحریکِ پاکستان کے ایک بہت فعال اور سرگرم رکن رہے ہیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے مختلف پہلوؤں اور اس کے واقعات پر ایک قابلِ قدر کتاب "بے تیغ سپاہی" قلم بند کی جس میں انہوں نے حضرت تاج الاولیاء بابا تاج الدینؒ کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

جب میں والد مرحوم کی انگلی پکڑ کر باباکے دربار میں گاہے گاہے جایا کرتا تھا باباصاحبؒ بالعموم لمبا کرتا پہنتے اور برہنہ سر اور برہنہ پا رہتے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت پاپیادہ

چلنے میں گزارا کرتے تھے۔ ایک دن اپنے سلیم شاہی جوتے پہنے ہوئے جس کی ایڑی کے حصے کو میں نے شرارت میں سپاٹ بنادیا تھا۔ باباصاحبؒ کے پیچھے پیچھے والد کے ساتھ جارہا تھا کہ باباصاحبؒ ایک دم رک گئے اور مجھ سے فرمایا۔ "لاؤ جی ہم تمہاری جوتی پہنیں گے۔" میں گھبرا گیا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ والد صاحب نے فوراً حکم کی تعمیل کرنے کو کہا۔ باباصاحبؒ نے اپنے پیروں کی چند انگلیاں ڈال کر میری جوتیاں پہن لیں اور تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ یقیناً یہ میری بڑی سرفرازی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد اس کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے اور جولائی ۱۹۶۱ ءمیں افریقہ کی سفارتی صحرانوردی کے بعد ختم ہوئے۔

ان کو روزانہ کا معمول تھا کہ وہ اپنا کچھ وقت تانگہ میں بیٹھ کر ناگپور کے گلی کوچوں میں پھر کر گزارا کرتے تھے۔ وہ اکثر ہمارے آبائی گھر کے سامنے سے جو میرے بزرگوں کے بسائے ہوئے نواب محلہ میں واقع تھا سواری میں گزار کرتے اور اسے رشکِ ارم بنائے۔ جذبۂ عشق خداوندی سے وہ اکثر اوقات بے تاب ہو کر بلند و پست آواز میں سلسلۂ تکلم جاری رکھتے جو بعض اوقات مجھ ایسے کوڑھ مغزوں کے لئے بے معنٰی لیکن عارفین حق کے لئے معرفت کا ایک بحرِ ذخّار ہوتا۔ ان کا جلال کبھی اتنا بڑھ جاتا کہ ستانے والوں کو زدوکوب سے بھی باز نہ آتے۔ اور حصوصاً ان کی بہت پٹائی کرتے جو ان کے سامنے منہ کے بل اوندھے پڑ جاتے یا پیر پکڑ کر منتیں مرادیں مانگتے۔ میں اس دن کا واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس دن میری بڑی بہن جو صرف خاندان ہی میں نہیں بلکہ اس سے باہر بھی بہت محبت و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ہم سب کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑنے والی تھیں۔ دوپہر سے قبل ہم سب نے بابا کی سواری کو اپنے غم کدہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا اور سب اہلِ خاندان میری بہن کی گرتی ہوئی حالت دیکھ

کر طالبِ دعا ہوئے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی اور سب کو یقین ہو گیا کہ بس اب دمِ واپسیں ہے۔ عزیزوں نے خاموش آہ وزاری شروع کر دی۔ عصر و مغرب کے درمیان اطلاع ملی کہ حضور کی سواری پھر آ رہی ہے۔ میں چشمِ پر نم کے ساتھ بے تحاشہ بھاگتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ حضور نے سواری رکوائی۔ کچھ بے ربط جملے فرمائے جو میں اس وقت سمجھ نہ سکا۔ غالباً رحلت کی اطلاع اور دلاسا دینا مقصود تھا۔

تیسرے واقعے کا تعلق میرے ہم عمر عزیز دوست سید عظیم الدین عرف میر صاحب سے ہے جو میرے بھائیوں جیسے تھے۔ میرے والد نے میر صاحب کی والدہ کو بہن بنایا تھا۔ اس مناسبت سے میں انہیں پھوپھی اور سید احمد حسین صاحب پٹیل کو پھوپھا کہتا تھا انہوں نے باباصاحبؒ سے بے پناہ عقیدت کی بنا پر ان کے دربارِ عرفان میں دنیا چھوڑ کر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر صاحب کو شکار کا اتنا شوق تھا کہ وہ ناگپور کے اکناف یا اپنے مال گزاری گاؤں کے اطراف تمام وقت ہرن کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ المختصر وہ دماغی توازن کھو بیٹھے اور مارنے پیٹنے پر اتر آئے۔ لوگ اور محلے والے ان سے ہراساں اور خوف زدہ رہنے لگے۔ ان کے والد نے دلی وابستگی کی وجہ سے میر صاحب کے ہاتھ پاؤں لوہے کی زنجیر میں باندھ کر ان کو تاج الاولیاءؒ کے دربار میں پہنچا دیا۔ میر صاحب تنو مند، گورے چٹے، خوبصورت، دراز قد نوجوان تھے۔ دست درازی اور دشنام طرازی اس زمانے میں ان کا شغلِ حیات بن گیا تھا۔ میں ان کی حالتِ زار دیکھنے اور چار آنسو بہانے روزانہ جاتا تھا۔ ایک دن میرے والد محترم نے جنہیں علمِ طب سے شغف تھا فرمایا اگر میر صاحب کی فصد کھلوائی جائے تو وہ اچھے ہو جائیں گے۔ جب میں نے یہ پیغام پٹیل صاحب کو ان کی فرودگاہ پر پہنچایا تو وہ بالکل چراغ پا ہو گئے اور فرمایا کہ باباصاحب کے دربار ان کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کیا جائے گا۔ میں آزردہ خاطر اپنا سا منہ لے کر گھر لوٹا

اور والد کو کل احوال سنایا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن میں نے دوسرے دن تک اپنا تمام وقت یہ سوچنے میں کاٹا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ حسبِ معمول عازمِ شکردرہ ہوا۔ دل نے کہا باباصاحبِ کشف ہیں۔ ان سے دل ہی دل میں کہہ ڈالو کہ میر صاحب کے والد کے دل میں خدا افصد کھلوانے کا خیال ڈال دے تاکہ میرا محبوب ترین دوست پھر سے تندرست ہو جائے۔ میں دربار میں پہنچا۔ وہاں روز جیسی چہل پہل تھی۔ عقیدت مند اور حاجت مند باباصاحب کو دو تہائی گھیر میں لئے بیٹھے تھے۔ باباصاحب ہمیشہ کے مطابق جذب سے سرشار اونچی اونچی آواز میں بولے چلے جا رہے تھے۔ دائرہ کا جو ایک نہائی حصہ کھلا پڑا تھا۔ اس سمت میں بہت دور میر صاحب زنجیروں کے بندھن میں چیختے چلاتے ہاتھ پیر مارتے ہوئے پڑے تھے۔ ایسی حالت میں بھی وہ مجھ سے قولاً یا فعلاً بری طرح پیش نہیں آئے۔ میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور باباصاحبؒ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت کی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس جھرمٹ میں پٹیل صاحب پھوپھا ہاتھ باندھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ان کی غیر متوقع موجودگی نے میری دل تمنا کو تازیانہ لگایا۔ اور میرا دل تڑپ گیا۔ اپنی دلی خواہش کو زبان ہلائے بغیر باباصاحبؒ تک پہنچا دیا۔ اور میں انتہائی توجہ کے ساتھ اپنے خواب کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور میں نے بے چینی سے جواب کا منتظر تھا کہ بہ آوازِ بلند ایک جملہ فرمایا گیا تاکہ پھوپھا صاحب، میں اور دیگر سامعین اچھی طرح سن لیں۔ ٹھیٹ مدراسی لب و لہجہ میں ارشاد فرمایا۔ "پیشانی کی رگ کاٹ کر خون نکال دیو جی، اچھے ہو جاتے۔" میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑا اور پھوپھا صاحب کی طرف جھپٹا۔ انہوں نے مجھے موقع دیئے بغیر کہا۔ "جاؤ بابا، تمہارا جو جی چاہے کرو۔" میں میر صاحب کو ٹانگہ میں دال کر گھر لے گیا۔ والد صاحب بہت خوش ہوئے اور بھونسلہ راجاؤں کے

خاندانی جراح سید احمد صاحب کو جونالے پار رہا کرتے تھے۔ شام کو بلوا کر میر صاحب کی فصد کھلوائی اور پھر میر صاحب اللہ کی مہربانی سے دوبارہ بھلے چنگے ہو گئے۔

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ سنا کر اپنی عقید تمندانہ شگفتگی کو تازہ اور زیادہ مستحکم کر دوں۔ اس زمانے میں سی پی و برار کے ہائی اسکولوں کا الحاق الٰہ آباد یونیورسٹی سے ہونے کی وجہ سے میٹرک کے امتحان کے پرچے الٰہ آباد یونیورسٹی سے آیا کرتے تھے۔ حساب کے تین علیٰحدہ پرچے ہوا کرتے تھے۔ میں میٹرک کے امتحان میں شریک ہوا لیکن حساب میں بہت کمزور ہونے کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ والد صاحب کے دل کو بہت ٹھیس لگی کیوں کہ انہوں نے میرے لئے بہت سے منصوبے تیار کھے تھے۔ میں بہت مایوس و شرمسار تھا۔ بالآخر کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت مل گئی۔ وہاں سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ حساب کا صرف ایک پرچہ ہوا کرتا تھا۔ امتحان میں شریک ہوا اور کلکتہ سے روزانہ ہوتے وقت چار دوستوں کو تاکید کر کے ناگپور لوٹا کہ نتیجہ جیسے ہی شائع ہو مجھے فوراً مطلع کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ امتحان کے نتیجے کا انتظار ایک طالبِ علم کے لئے کس قدر جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ میری بھی یہی اضطرابی کیفیت تھی۔ اور کبھی کبھی تو میرا اضطراب اس خیال سے ہوش اڑا دیتا تھا کہ اگر اب کے ناکام ہو گیا تو والد صاحب کو ناقابلِ بیان صدمہ ہو گا اور میں نہیں اپنا منحوس چہرہ کیسے دکھاؤں گا۔ کلکتہ سے نتیجے کی وصول یابی میں کافی تاخیر ہو جانے کی وجہ سے دل بہت پریشان تھا۔ میں اس دن شکر درہ میر صاحب کی عیادت کو گیا تڑپتے دل سے دل ہی دل میں باباصاحبؒ سے عرضِ مدعا کر بیٹھا یعنی آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس دربار سے تو کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ لہٰذا میں کیسے بے مرام ہوتا۔ فدائیوں نے حضور کو گھیر رکھا تھا۔ میں بہت دور سوالی بنا ہوا میر صاحب کے پاس بیٹھا کسی کرامت کا انتظار کر رہا تھا۔ معلوم نہیں زور

زور سے کیا کیا بہت سے بے ربط جملے ارشاد کئے جا رہے تھے کہ کیا دیکھتا ہوں عیسیٰ خاں صاحب جو ان کی خدمت میں اکثر حاضر رہا کرتے اور باباصاحبؒ کی ڈاک رکھا کرتے تھے باباصاحبؒ کے جو کھردری زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ پیر دبا رہے تھے، باباصاحبؒ اچانک اٹھ بیٹھے۔ عیسیٰ صاحب کے کرتے کی بالائی جیب میں ہاتھ ڈال کر چار پوسٹ کارڈ ہوا میں پھینکتے ہوئے بآواز بلند فرمایا۔ "جاؤ جی، نتیجہ آگیا، پہلے درجے میں پاس کر گئے۔ "میں خوشی خوشی بائیسکل لے کر گھر کے لئے روانہ ہوا۔ مکان کے باہر شہ نشیں کے قریب پہنچ کر سائیکل سے اترا ہی تھا کہ دور سے کسی نے زور سے پکار کر کہا۔ "میاں! میاں! ذرا رک جائیے اور اپنی ڈاک لیتے جائیے۔" دھڑکتے ہوئے دل سے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکیہ نے چار پوسٹ کارڈ دیئے۔ مضمون من و عن وہی تھا جس کا انکشاف پہلے ہی تاج الاولیاء کر چکے تھے۔

نواب صدیق علی خاں مزید لکھتے ہیں۔ "ایک دن میرے والد صاحب حضرت باباصاحبؒ کے لئے نہایت اہتمام سے انڈے کی مٹھائی جسے پیوسی کہا جاتا تھا، بنوا کر لے گئے۔ باباصاحبؒ پاگل خانے کے باہر سڑک کے کنارے گٹی کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چند حاجت مند لوگ منت اور مرادوں کے کشکول لئے ہوئے دربار میں موجود تھے۔ والد نے مٹھائی پیش کی جسے حضور بہت شوق اور رغبت سے کھانے لگے۔ والد صاحب کے دل میں مغایہ خیال آی کہ حضور کو ایسی مٹھائی کہاں سے ملتی ہو گی۔ حضور نے فوراً ہاتھ روک لیا اور پتھر اٹھا کر اس طرح آسانی سے کھانے لگے جیسے بڑا لذیذ حلوہ کھا رہے ہوں۔ جب والد نے ندامت کے آنسو بہائے اور دل سے توبہ کی تو حضور نے پتھروں کا کھانا بند کر دیا۔"

ہندو مسلم فساد:

ڈاکٹر سید محمود صاحب بہار کے رہنے والے تھے۔ جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹر ہوئے۔ پٹنہ میں پریکٹس کرتے تھے۔ لیکن تحریکِ خلافت کے وقت میدانِ سیاست میں آ گئے۔ کانگریس کے ممتاز لیڈر تھے اور معتمد بار صوبے اور مرکز میں وزیر مقرر ہوئے۔ مصر میں سفارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ڈاکٹر محمود صاحب بیان کرتے ہیں:

۱۹۲۴ء میں ناگپور میں ہندو مسلم جھگڑے چل رہے تھے۔ بہت کشت و خون ہو رہا تھا۔ طرفین سے لوگ جیل جا رہے تھے۔ مسجد کے سامنے باجے کا جھگڑا تھا۔ گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ تم وہاں جا کر اس کو طے کراؤ۔ مولانا شوکت علی مرحوم پہلے جا چکے تھے۔ لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے پہلے وہاں جانے سے انکار کیا۔ پھر گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں صاحب کے اصرار پر راضی ہوا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ تم کو بزرگوں سے ملنے کا شوق ہے۔ وہاں جا کر تم بابا تاج الدین سے ملنا اور ان سے اس جھگڑے کے طے ہو جانے کے لئے دعا کرانا۔

میں ناگپور گیا اور تاج الدین کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ راجہ بھونسلہ کے قلعے کے اندر رہتے تھے۔ راجہ ان کی بڑا معتقد تھا۔ اور ان کی بڑی خدمت کرتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ بابا آج باہر نہیں نکلیں گے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں دروازے پر کھڑا تھا کہ سامنے دالان میں ایک دراز قد سیاہ فام بزرگ جن کی آنکھیں سرخ تھیں۔ یک بیک آ کر کھڑے ہو گئے اور پھر اندر چلے گئے۔ نوکر نے آ کر آواز دی کہ بابا اب نکل لیں۔ چنانچہ وہ نکلے اور ایک فٹن میں سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ لوگوں کا اژدہام گاڑی کے پیچھے دوڑا اور ان پر پھول پھینکتا رہا۔ اور بابا کچھ بولتے رہے۔ اسی میں لوگ اپنے مطلب کی بات

نکال لیا کرتے لیکن کسی سے بھی کوئی بات صاف نہیں ہوتی۔ مجھ سے بھی لوگوں نے گاڑی کے ساتھ دوڑنے کی فرمائش کی لیکن میں نہیں گیا۔ پھول البتہ ان پر پھینک دیا۔ لوگ اس طرح ان کے ساتھ میل دو میل دوڑا کرتے۔ یہ برابر کا دستور تھا۔ میں موٹر پر تھا۔ کچھ دیر بعد میری موٹر نے دوڑ کر ان کی گاڑی کو پکڑ لیا۔ اب لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ میں گاڑی پکڑ کر چلنے لگا۔ بابا میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ "کیا چاہتا ہے، مکہ مدینہ جائے گا؟"

میں نے عرض کیا۔"انگریزوں کی غلامی اب برداشت نہیں ہوتی۔ ہندو مسلمانوں کو برابر لڑاتے رہتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے کب تک جائیں گے ؟"

بابا نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہاں! ہاں! ضرور چلے جائیں گے۔"

راجہ کے دو ملازم گاڑی پر ان کے ساتھ ہاتھ باندھے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ بابا سے ایسی صاف بات شاید انہوں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ وہ بہت گھبرائے اور کہا کہ آج تک بابا نے ایسی صاف طور پر بات نہیں کی تھی۔ تم تو کوئی دیوتا معلوم ہوتے ہو۔ پھر میں نے کہا کہ آپ کی موجودگی میں ناگپور میں ہندو مسلم جھگڑا ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے۔ ہندو تو آپ اس قدر سیوا کرتے ہیں، پھر مسلمانوں سے کیوں لڑتے ہیں؟ آپ دعا کیجئے کہ یہ قضیّہ طے ہو جائے۔"

بابا نے کہا۔ "ہاں ضرور طے ہو جائے گا۔"

اس طرف سے کچھ سفید پوش مسلمان گزر رہے ۔ میں نے ان کو مخاطب کر کے آواز دی کہ دیکھو بابا کیا کہتے ہیں۔ بابا کہتے ہیں کہ ہندو مسلم جو جھگڑا ہو رہا ہے وہ طے ہو جانا چاہئے۔

بابا نے کہا۔ "ہاں! ہاں! طے ہو جانا چاہئے۔"

جب میں گاڑی سے اترنے لگا تو بابا نے پوچھا۔ "اور کیا چاہتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کی دعا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے سر سے اتار کر ایک سرخ ٹسر کا مرہٹی صافہ مجھے دیا۔ اور کہا "رکھ لے، ہندو مسلم جھگڑا میں نے طے کرا دیا۔"

میں پھر بابا کے پاس گیا۔ راجہ کو معلوم ہوا۔ اس نے مجھے بلوایا اور میرے پیروں پر پھول چڑھائے اور مٹھائی رکھی کہ آپ تو کوئی دیوتا ہیں مجھے اپنے ملازمین سے آپ اور بابا کی گفتگو کا حال معلوم کر کے تعجب ہوا کہ ایسی صفائی سے گفتگو بابا کسی سے نہیں کرتے۔ پھر مجھے بابا کے پاس بھجوا دیا۔ وہ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور ایک ملازم ان کی پیر دبا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "بابا! وہ ہندو مسلم جھگڑا آپ کی دعا سے طے ہو گیا۔"

کہا۔ "اچھا ہوا۔"

پھر میں نے سوال کیا کہ بابا، انگریز اس ملک سے کب تک جائیں گے؟"

باباؒ نے خفا ہو کر جواب دیا۔ "ارے میاں، جب تم لوگ اس قابل ہو گے تو خود چلے جائیں گے۔"

میں ذرا سہم گیا۔ باباؒ نے رٹ لگائی۔ "گھر جاؤ۔"

میں کچھ دیر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن باباؒ یہی کہہ رہے تھے کہ گھر جاؤ گھر جاؤ۔ میں مجبور ہو کر اٹھ آیا۔ میرے ہمراہ دو صاحب تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ "دیکھیے! میں آپ کو ہر چند یہاں آنے سے منع کرتا رہا مگر آپ نہ مانے۔ یہ ایک مجنون آدمی ہے۔ اس کو فقیر بنا رکھا ہے اور بداخلاق کس قدر ہے کہ آپ کو بیٹھنے بھی نہ دیا۔ اور اپنے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ اٹھا دیا۔"

دوسرے صاحب نے کہا۔ "نہیں، باباصاحبؒ کا مطلب ہے کہ مسلمان اپنے گھر یعنی مکہ مدینہ چلے جائیں اور پھر یہاں فاتح کی حیثیت سے آئیں۔"

مجھے ان کے اس استدلال پر ہنسی آگئی۔ بہر حال میں اسی دن شب میں الٰہ آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن آنند بھون (پنڈت جواہر لال نہرو کا گھر) پہنچا جہاں میں ٹھہرا کرتا تھا۔ وہاں میرے لئے ایک تار پہلے سے آیا ہوا تھا کہ جونپور میں میرے ماموں زاد بہنوئی کا اسی وقت انتقال ہوا جس وقت کا باباؒ سے ناگپور میں باتیں کر رہا تھا۔

بھوت بنگلہ :

ماہ نامہ اردو ڈائجسٹ میں بابا تاج الدینؒ سے متعلق واقعات "تاج الدین باباؒ" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ ان واقعات کے راوی خان رشید صاحب ہیں۔ ماہ نامہ اردو ڈائجسٹ کے شکریے کے ساتھ ان واقعات کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

پراسرار قہقہہ :

نوجوان عثمان اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے ناگپور تعینات کیا گیا۔ اس نے اس بنگلے میں قیام کیا وہ آسیب زدہ مشہور تھا۔ لوگوں نے اسے پہلے پیش آنے والے واقعات سنا کر بنگلے میں قیام کے ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ انگریز اسٹیشن ماسٹر، نورس نے بھی منع کیا۔ لیکن اس نے ان باتوں پر توجہ نہ دی۔

رات کو بارہ بجے جب عثمان بستر پر لیٹا ہوا تھا، باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ اور چیخیں بلند ہوئیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بنگلے کے احاطے میں ایک زوردار قہقہہ گونجا۔ اور کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ صبح عثمان کمرے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ حیران رہ گیا کہ برآمدے میں ہلدی میں پکے ہوئے

چاول اور مٹی کی ایک ہنڈیا ٹوٹی پڑی تھی۔ اگلی رات بھی اس سے ملتا جلتا شور سنائی دیا اور صبح برآمدے میں ایک انسانی ہاتھ پڑا ہوا ملا۔

ان حالات کے باعث کے اعصاب جواب دے گئے اور اگلی رات اس نے ایک ہوٹل میں گزاری۔ حسبِ عادت صبح عثمان جب چہل قدمی کے لئے نکلا تو ایک جگہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گیا۔ ہجوم ایک سبز پوش بوڑھے کے پیچھے لگا ہوا تھا جو منہ ہی منہ کچھ بول رہا تھا۔ اس دوران بوڑھا تانگے میں سوار ہو کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ بزرگ تاج الدین باباؒ ہیں۔ عثمان پہلے تاج الدین بابا کا تذکرہ ایک ولی اللہ کی حیثیت سے سن چکا تھا۔

مٹی کی تصویر:

سیر کے دوران عثمان کالج کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک ہم وطن عبدالغفار نے آواز دی۔ وہ ان دنوں قانون کا طالبِ علم تھا۔ اس کے جبل پور کے دو اور ساتھی فضل الکریم اور عباسی بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہیں عثمان کی آمد کا علم ہوا تو خوشی میں چائے پر مدعو کر لیا۔

مقررہ وقت پر وہ ہاسٹل پہنچ گیا۔ "چلو چائے شہر میں پئیں گے۔" عباسی نے کہا "موقع ملا تو تاج الدین باباؒ سے بھی مل لیں گے۔"

سارے راستے اسی نوع کی گفتگو ہوتی رہی۔ اسی میں معراج کا مسئلہ چل نکلا فضل الکریم روحانی اور عبدالغفار جسمانی معراج کے قائل تھے۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں چائے پی کر وہ لوگ شکر درہ پہنچے تو وہاں عجیب منظر دیکھا۔ ایک فوٹو گرافر بڑا سا کیمرہ تپائی پر جمائے باباؒ کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ اور وہ اس پر رضا مند نہ تھے۔ تاہم اس کے اصرار پر

کرسی پر بیٹھ گئے مگر وقت پر ہل جاتے تھے۔ فوٹو گرافر افسردگی سے بولا۔ "بابا! میں تو آپ کی تصویر فروخت کر کے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں تھا مگر آپ کو ذرا خیال نہیں۔"

"کیا بولا رے، کیا بولا!" بابا تڑپ گئے۔ "لے! اچھا تار لے مٹی کی تصویر۔"

تصویر کھینچ لی گئی، فوٹو گرافر خوش ہو گیا۔ معاً بابا کی نگاہ ان چاروں پر پڑی تو تیوری پر تل پڑ گئے اور بولے۔ "انگریزی پڑھ کے آئے اور کہتے ہیں کہ حضورؐ کو معراج روحانی ہوئی تھی۔"

چاروں چونک پڑے اور باباؒ اپنے حجرے کی طرف چل دیئے۔ اب انہیں باباؒ کے سامنے جانے کی ہمت نہ تھی۔ واپسی کا ارادہ کیا مگر عثمان اور عبدالغفار آگے بڑھے ایک خدمت گار باباؒ کے پاؤں دابنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بابا نے اسے منع کر دیا اور عبدالغفار کی جانب دیکھ کر بولے۔ "لے رے لڑکے، تو پیر دبا۔"

عثمان نے بھی شامل ہونا چاہا لیکن باباؒ نے اسے منع کر دیا۔ عبدالغفار نے پنڈلی کو ہاتھ لگایا تو وہ بے حد سخت تھی۔ بابا نے پٹھے اکڑا لئے تھے۔ دو منٹ بعد اس نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ "بابا! آپ کو پنڈلی اکڑائے بیٹھے ہیں۔ میں پاؤں کیسے دباؤں؟"

"تو ڈھیل کر لے نا، لگا سائنس کا زور۔"

"اس میں سائنس کام نہیں آتی۔ آپ خود پاؤں ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔"

وہ پہلے ہنسے اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ "تو اچھا لڑکا ہے، بتا کیا چاہتا ہے۔"

"بابا! پڑھ لکھ کے نوکری تو مل جائے گی مگر خدا کیسے ملے؟"

وہ قدرے چونک کر کہنے لگے۔"محنت کرتے، بچے پالتے، خدا مل جاتا جی۔"
فضل الکریم اور عباسی داخل ہوئے تو وہ ادھر متوجہ ہو گئے۔کیوں رے! اب بتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج روحانی ہوئی کہ جسمانی؟"

دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔عبدالغفار فوراً بولا۔"بابا غلطی ہوئی۔معاف کردو۔"

وہ خوش خوش نظر آئے ، پھر یوں گویا ہوئے۔"کرسی پر بیٹھ گے، فوٹو اتروا ؤگے، پھر سمجھ میں آجائے گا۔اچھا اب تم جاؤ۔"

پراسرار گارڈ:

عثمان عرضِ مدعا نہ کر سکا اور اٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ باباؒ کی آواز آئی۔"او نالائق! تو کائے کو ڈرتا ہے؟ ڈنڈا رکھ کے سونا۔وہ آئیں گے، مار دینا۔" عثمان ان کی طرف متوجہ ہوا تو ہنس کے بولے۔"تیری سمجھ میں بھی آجائے گا، معراج جسمانی ہوئی کہ روحانی۔"

پھر دوسرے لوگوں کی جانب متوجہ ہو گئے اور مخصوص انداز میں بولنے لگے۔
اسی لمحے عثمان کو بنکٹ راؤ گارڈ کونے میں بیٹھا نظر آیا۔وہ ٹکٹکی باندھے بابا کو دیکھے جا رہا تھا۔اس وقت چھ بجے تھے اور بنکٹ راؤ کو سوا چھ بجے والی گاڑی لے کر بمبئی جانا تھا۔لیکن ابھی تک اس نے وردی بھی نہیں پہنی تھی۔اور اتنے کم وقت میں وہ اسٹیشن مشکل ہی سے پہنچ سکتا تھا۔بابا نے بنکٹ راؤ کو "سلیمان" کہہ کر مخاطب کیا اور آہستہ سے کچھ کہا۔اس پر وہ مسکرا دیا لیکن اسی جگہ بیٹھا رہا۔

یہ چاروں باباتاج الدینؒ کی روشن ضمیر سے بے حد متاثر ہو کر اٹھے۔ عثمان کو تو جیسے چپ ہی لگ گئی تھی۔ ڈنڈار کھ کے سونا، وہ آئیں گے، مار دینا۔" باباکے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے اور وہ ان کے مفہوم سے بے خبر تھا۔ پھر سوچنے لگا، ڈنڈے سے کیا بنے گا۔

راستے میں عثمان نے تفصیل سے آسیبی بنگلے کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے دوستوں کو باباصاحبؒ کی ہدایت بتائی کہ ڈنڈار کھ کر سونا۔ وہ سب حیران رہ گئے اور معمہ حل نہ کر سکے۔ پروگرام بناکر پہلے اسٹیشن پر چائے پی جائے اور پھر بھوت بنگلہ کی سیر کی جائے۔

عثمان نے کہا۔"میں بنکٹ راؤ کے بارے میں سوچ رہاہوں۔ اسے سواچھ بجے پسنجر لے کر اٹاری جاتا ہے لیکن وہ تو باباکے پاس بیٹھا ہے اور واپس آتا نظر بھی نہیں آیا۔ سواچھ بجنے میں ایک منٹ باقی ہے۔"

فضل الکریم نے بے ساختہ پوچھا۔"یہ وہی گارڈ تو نہیں جو دوہری شخصیت کی وجہ سے مشہور ہے۔ بیک وقت باباکے پاس رہتا ہے اور ڈیوٹی پر بھی۔ سنا ہے باباصاحب کا خاص معتقد اور فنائی الشیخ ہے۔"

وہ سیدھے اسٹیشن پہنچے اور پلیٹ فارم پر قدم رکھا ہی تھا کہ اٹاری پسنجر سیٹی دے کر روانہ ہوئی۔ گارڈ کا ڈبہ سامنے سے گزرا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بنکٹ راؤ وردی میں ملبوس سبز جھنڈی ہلا رہا ہے۔ پھر اس نے انہیں سیر کی جنبش سے سلام کیا۔ اور دور تک مسکراتا رہا۔ بنکٹ راؤ کا اتنے کم وقت میں اسٹیشن پہنچ جانا ان کے لئے معمہ بن گیا۔ پھر ایک ساتھی نے تجویز پیش کی۔ ہمیں باباجی کے پاس جاکر تمام واقعے کی تحقیق کرنی چاہئے۔ وہ لوگ دوبارہ شکر درا پہنچے۔ فضل الکریم اور عباسی سڑک ہی پر رک گئے کہ

باباجی کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ عبدالغفار اور عثمان نے ہمت کی حجرے میں میلاد شریف کا غلغلہ بلند تھا۔ انہوں نے جھانک کر دیکھا۔ سلام پڑھا جا رہا تھا۔ باباجی حالتِ وجد میں جھوم رہے تھے۔ اور بنکٹ راؤ ان کے قریب مؤدب کھڑا تھا۔ باباجی آنکھیں بند تھیں اور ان سے اشک رواں تھے۔

معراج:

"ارے فوج! درود پڑھو۔ بڑے سرکار کی سواری آرہی ہے۔" درود کا غلغلہ بلند ہوا اور ایک لطیف سی خوشبو پھیل گئی۔ سلام پڑھا جا چکا تھا۔ باباجی فرش پر بیٹھ گئے اور ذرا فاصلے پر بنکٹ راؤ بھی۔ وہ دونوں حجرے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ اس حیرت انگیز پر ان کے ساتھی منتظر تھے۔ پھر ایک عجیب منظر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ عباسی اور فضل الکریم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ باباجی خود ان کے سامنے موجود تھے اور ان پر جلال کی کیفیت طاری تھی۔ انہوں نے پلٹ کر حجرے کی طرف دیکھا تو ان کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ بابا حجرے میں تھے۔ شاید یہ کوئی دوسرے بزرگ ہوں۔ اسی لمحے باباجی کی جانی پہچانی آواز نے ان کا شبہ دور کر دیا۔ مگر وہ کب اور کیسے وہاں پہنچے۔ جب کہ راستہ صرف وہی تھا۔ وہ حیرت کی تہوں میں اترتے جا رہے تھے۔

"انگریزی پڑھنے والو! بتاؤ، حضورؐ کو روحانی معراج ہوئی تھی؟" باباتاج الدینؒ بابا کی آواز میں غصہ غالب تھا۔ "اب لڑاؤ اپنی سائنس!"

"معاف کر دیجئے باباجی! غلطی ہوئی۔" عبدالغفار نے عاجزی سے کہا۔

وہ فوراً ادھر متوجہ ہوئے۔ ان کی تیوری پر بل تھے اور چہرے پر ملال اور ناگواری کا عکس۔ "نامعقول، تو تھا آگیا! جا تیرا عہدہ گھٹا دیا۔"

ان کے بپھرے تیور دیکھ عثمان عبدالغفار کی اوٹ میں دبک گیا۔ اس کی سراسیمگی دیکھ کر باباکو ہنسی آگئی۔ " توکائے کو ڈرتاہے عثمان! ڈنڈا رکھ کے سوجا۔۔۔ سلیمان کی ٹوہ نہ کرنا، اپنی ٹوہ لگانا۔ پھر سمجھ میں آجائے گا معراج کس کو بولتے ہیں۔"

اس رات بھوت بنگلے کا پروگرام کر کے وہ تینوں کالج ہوسٹل چلے گئے۔ اور عثمان بنگلے واپس آگیا۔ اس رات کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

بھیانک رات:

اگلی صبح اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ چوتھے بنگلے کے ڈاکٹر چودھری کی تختی اس نے پہلے بھی دیکھی تھی جس پر خاصے موٹے حروف میں اس کی ڈگریاں کندہ تھیں۔ مگر اس وقت وہ ساری ڈگریاں ایک خوبصورت چہرے کی اوٹ میں چھپ گئیں۔

"ٹامی، ٹامی!" ایک باریک نسوانی آواز بلند ہوئی۔ اس نے ایک چھوٹے سے کتے کو دم ہلاتے دیکھا۔ پھر وہ خوبصورت چہرہ اندر چلا گیا۔ اس خاتون کا ذکر اس سے کسی دوست نے کیا تھا۔ اس کا نام للیتادیوی تھا۔ وہ ڈاکٹر چودھری کی بیوی تھی اور ڈاکٹر چودھری ریلوے میں اچھے مشاہرے پر ملازم تھے۔

اس رات دو بجے کے قریب اچانک عثمان کی آنکھ کھلی ۔ باہر احاطے میں قدرے منحنی آواز میں وحشت خیز قہقہہ بلند ہوا۔ کسی کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دی۔ پھر بجلی کی طرح اسے باباکے الفاظ یاد آئے۔ عثمان نے ڈنڈا سنبھالا۔ ٹارچ اٹھائی اور جی کڑا کر کے دروازے کا پٹ کھول دیا۔ برآمدہ بالکل سنسان تھا۔ ٹارچ کا رخ بڑے لان کی طرف مڑا تو سوکھے گملوں کی اوٹ میں دو سرخ سرخ انگارے چمکے اور غائب ہوگئے۔

اسے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور دہشت سے جھر جھری آگئی۔ وہ اندر آیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ کمرے کے اندر ہیبت ناک چیخ بلند ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ ڈنڈا مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر دس منٹ بعد چھت کی پراسرار آوازیں اچانک مدھم ہو گئیں۔ عثمان کی نظر روشندان کی ڈوری پر چلی گئی۔ وہ ہل رہی تھی۔ بالائی سرے پر کوئی چیز رسی سے لپٹی نظر آئی۔ دھندلا اور پراسرار ہیولی رسی پر سرکتا ہوا نیچے کی طرف آیا۔ اس کے تعاقب میں ویسا ہی ایک اور سایہ دکھائی دیا۔ وہ رسی کے سہارے فرش پر اترے اور سرکتے ہوئے چارپائی کی جانب بڑھے۔ عثمان نے تاک کر دونوں کے سر کچل دیے۔ اور اسی لمحے باباکے الفاظ اسکے کانوں میں گونجنے لگے۔ "کیا اور بھی آئیں گے۔" وہ سوچنے لگا۔

سانپوں کے مر جانے کے بعد صبح تک کوئی پراسرار آواز نہ آئی۔ چڑیاں چہچہانے لگیں۔ عثمان اٹھا۔ لباس تبدیل کیا۔ اور مردہ سانپ وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ چند چڑیاں برآمدے میں بکھرے ہوئے زرد چاول چگ رہی تھیں۔ احاطے میں آیا تو رات کے پراسرار قہقہے اس کے ذہن میں اجاگر ہوگئے۔ گملوں کی اوٹ میں جدھر دو انگارے سے چمکے تھے، ادھر نگاہ دوڑائی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خشک اور ویران لان میں خون کے تازہ دھبے دکھائی دیے۔ اس کے قدم رک گئے۔ دوسری جانب سے لمبا چکر کاٹ کر گیٹ کی جانب بڑھا ہی تھا کہ وہاں یاک تانگہ آکر رکا۔ آنے والے عبدالغفار اور فضل الکریم تھے۔

عثمان نے ان کو سارے واقعات سنائے اور جائے وقوع دکھائی۔ فضل الکریم نے بنگلے کا بغور جائزہ لیا۔ اور سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع بھنگیوں کی بستی میں پہنچا۔ وہاں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بھگوت نامی بھنگی کا کتا

غائب ہے۔ فضل الکریم نے بستی کے مکینوں کو بتایا کہ کتے کو کسی نے مار دیا ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ اس کتے کی شرارتوں سے تنگ آ کر اسے بستی سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ اورا س نے ایک مرگھٹ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ رات گئے مرگھٹ سے لوگوں کے گھروں میں آ کر چیزیں چرا لے جاتا تھا۔ وہ ہنڈیا لے کر بھاگ جاتا اور ہنڈیا کو زور زمین پر مار کر توڑ دیتا اور کھانا کھالیتا تھا۔ اس انکشاف سے سب کو پتہ چلا کہ بھوت بنگلے میں پائی جانے والی ہنڈیا اور چاول بھگوت کے کتے کی کارستانی تھی۔ فضل الکریم سب کے ساتھ دوبارہ بنگلے آیا۔ اور وہاں خون کے دھبوں کے قریب پائے جانے والے نشانات کو دیکھ کر بتایا کہ ان ہی نشانات کی وجہ سے اس کا ذہن بھوت بنگلے کے واقعات کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوا ہے۔ فضل الکریم نے انکشاف کیا کہ وہ نشانات لکڑ بگے کے پیروں کے ہیں جو کتے کا گوشت شوق سے کھاتا ہے۔ اور پھر ایسی آواز نکالتا ہے جیسے قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ پہلی دو راتیں کتے اور لکڑ بگے میں کشمکش ہوتی رہی اور پھر کتا قابو میں آ گیا۔ انسانی ہاتھ بھی کتا ہی مرگھٹ سے اٹھا لایا تھا۔

فضل الکریم باتیں کرتے کرتے یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ اور غور سے بنگلے کا چھپر دیکھنے لگا۔ ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر عمارت کے گرد عمارت کے گرد ایک چکر لگایا۔ اور واپس آ کر پراسرار انداز میں گویا ہوا۔ جلدی سے ایک سیڑھی اور دو تین جھاڑو کا بندوبست کر ڈالو۔"

سیڑھی ڈاکٹر چودھری کے بنگلے سے مل گئی۔ فضل الکریم نے چھت گیری ادھیڑ کر علیٰحدہ کر دی۔ گرد کی موٹی تہ غبار کی شکل میں کمرے میں پھیل گئی۔ چھپر اور چھت گیری کے درمیانی خلا کی صفائی مدت سے نہ ہوئی تھی۔ مختلف پرندوں نے گھونسلے

تیار رکھے تھے اور چھپکلیاں بری تعداد میں رینگ رہی تھیں۔ فضل الکریم نے سارے آشیانے اجاڑ دیے۔

دو روز گزر گئے اور کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ وحشت کا احساس زائل ہوتا رہا۔ پھر عثمان کا اعتماد مکمل طور پر بحال ہوگیا۔ تاہم اس کے ذہن میں ایک نامعلوم سی خلش موجود تھی۔

بڑادیو:

ایک شام وہ کالج ہاسٹل سے لوٹ رہا تھا کہ باباجی تانگے میں آتے دکھائی دیے۔ وہ گھبرا کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔تانگہ قریب آکر رک گیا۔ باباجی نیچے اترے اور اسی طرف چل دیے جہاں عثمان درخت کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ عثمان تھر تھر کانپنے لگا۔ باباجی کو ہنسی آگئی۔"او عثمان !اب کائے کو چھپتارے، سانپاں تھے مر گئے۔ اب کائے کو ڈرتا، نکو ڈرتے رے،تاج الدین سے نکو ڈرتے۔اللہ سے ڈرتے۔"

عثمان نے ادب سے سلام کیا۔ باباجی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ ہی تانگے میں بٹھالیا اور شکر درا کی طرف چل دیے۔

آبادی سے گزرے تو معتقدین کے ایک ہجوم نے تانگہ گھیر لیا۔ مجبوراً باباجی نیچے اتر آئے۔ حاجت مندوں کو دعائیں دیتے، جھڑکتے، حالتِ جذب میں مسکراتے، خفا ہوتے اور عثمان کا ہاتھ پکڑتے آگے بڑھتے رہے۔شکر درا تک سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔

معتقدین کے جلو میں بابا اور عثمان راجہ رگھو جی کے محل میں داخل ہوئے اور اس چھوٹے سے مندر کا رخ کیا جہاں تین دن پہلے سالانہ میلا لگا تھا۔ چہل پہل ابھی باقی

تھی باباجی کو دیکھ کر دو تین پنڈت ہاتھ جوڑے باہر نکل آئے۔ باباجی نے نرم لہجے میں کہا۔ "تمہارا بڑا دیو بڑا میلا کچیلا اور گندا لگتا جی۔ میں اسے نہلا دوں؟"
نہیں بابا! آپ دیا کریں۔ ہم آپ ہی اشنان کرا دیں گے۔" انہوں نے گھبرا کر جواب دیا۔
" بابا کو نہلانے دیتے رے! تم پنڈتاں رگھوجی کی اور اپنی لٹیا ڈبو کر دم لوگے۔ تاج الدین کی بات مان لیتے رے!"
"نہیں بابا!" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ بابا ہنس کر آگے بڑھ گئے اور پھر آہستہ سے بڑبڑائے۔ "عثمان! تو ان کے مہادیو کو ضرور نہلا نا رے۔"
عثمان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور پنڈتوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ عثمان کو بعد میں معلوم ہوا کہ بابا پہلے تھی ایک بار اسی طرح مندر میں آئے تھے اور انکی بات پر ہندو بگڑ گئے تھے لیکن کسی کو الجھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔
اسی احاطے میں راجہ رگھوجی نے لوہے کے کٹہرے میں شیر پال رکھا تھا۔ بابا کی نگاہ اس پر گئی تو بولے "ارے، اسے کیوں بند کر رکھا ہے؟ بے چارہ پریشان ہو رہا ہے نا۔ کنبے سے بچھڑ گیا۔ کتا بن گیا، ٹامی ٹامی!"
عثمان چونک پڑا۔ ڈر کے مارے اس کا سانس پھولنے لگا اور جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ بابا نے بڑھ کر پنجرے کا پھاٹک کھول دیا۔ شیر باہر نکل آیا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف بابا کا خادم پہلوان بنکٹ راؤ اور عثمان رہ گئے۔ باباؒ نے کہا۔ "بڑا اچھا کتا ہے۔" پھر عثمان اور بڑے دیو کو نہلائے گا؟"

اس براہِ راست خطاب سے عثمان کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر گھگی بندھ گئی۔ اس کی نظریں شیر پر جمی ہوئی تھیں مگر بنکٹ راؤ ہر بات سے بے نیاز صرف باباجی کو دیکھ رہا تھا۔ باباجی شیر کا چمکارتے ہوئے اپنے حجرے تک لے گئے۔

کسی نے راجہ رگھوجی کو خبر کر دی۔ وہ رائفل سنبھالے دوڑا آیا۔ اور یہ دیکھ کر ششدرہ رہ گیا کہ شیر باباجی کے قدموں میں بیٹھا ہے۔

"او نالاں! اب کائے کو آیا۔ کتے کو پنجرے میں ڈالتے تو بھوکا نکو رکھے۔ تیرے کو بھی پنجرے میں بند کر دوں؟"

"نہیں باباجی!" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ "آپ اسے کٹہرے میں بند کر دیجئے۔ لوگ ڈر رہے ہیں۔"

" یہ آپی بند ہو جائے گا۔ کل سے بھوکا ہے۔ تو اس کے کھانے کا بندوبست کر۔"

"میں ابھی بندوبست کرتا ہوں باباجی مگر........."

"مگر وگر کچھ نہیں۔" بابا بگڑ بیٹھے اور پھر شیر سے مخاطب ہوئے۔ "جارے جا، تیرا راتب مل جائے گا۔ اپنے پنجرے میں انتظار کر۔"

شیر نے حکم کی فوراً تعمیل کی رگھوجی کو تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ شیر واقعی جو بیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ گوشت کا انتظام جس آدمی کے سپرد تھا وہ بغیر بتائے چھٹی کر گیا تھا۔

عثمان چپکے سے واپس آ گیا اور بابا کے پاس دوبارہ نہ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

زہریلی چھپکلی:

ایک دن عثمان کالج ہوسٹل پہنچا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ کچھ ہی دیر پہلے تاج الدین باباؒ ادھر سے گزرے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈھاک کے پتے کا دونا تھا۔ سیدھے ہندوؤں کے میس میں آئے اور رسوئی میں گھس گئے۔ ہندوؤں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ چند متعصب طلبہ بہت طیش میں آئے مگر باباکا احترام ان کے ارادوں میں حائل ہو گیا۔ بابانے کڑھی نما سالن کا پتیلا کھولا۔ پھر فوراً پلٹے اور چیختے چلاتے ڈائننگ ہال کی طرف لپکے۔ ایک چٹادھاری برہمن کے ہاتھ سے نوالہ چھین لیااور کڑھی کا پیالہ اٹھا کر فرش پر انڈیل دیا۔ "یہ نکو کھاتے رے، نکو کھاتے۔" وہ زور زور سے کہتے رہے، "سب پھینک دو!"

یہ پہلی تھائی تھی جو ہال میں کھانے کے لئے لائی گئی تھی۔ لڑکے باباکی حرکتوں پر خفااور حیران تھے لیکن وہ برہمن لڑکا اچھل پڑا جس کے قریب پیالہ انڈیلا گیا تھا۔ سالن میں زہریلی مردہ چھپکلی پڑی تھی۔

باباوہاں سے سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جہاں عبدالغفار اور فضل الکریم بیٹھے تھے۔ ہاسٹل میں مسلمانوں کے لئے کھانے کا بندوبست نہ تھا۔ وہ اپنے ایک اور ساتھی کا انتظار کر رہے تھے کہ کھانا باہر جا کر کھائیں۔ باباکو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ انہوں نے ادب کے ساتھ سلام کیا۔ بابانے سلام کا جواب دیتے ہوئے دونا ان کی طرف بڑھا دیا۔ اس میں چھ گلاب جامن تھے۔ ان میں سے دو گلاب جامن فضل الکریم اور عباسی کو دیے ہی تھے دس بارہ ہندولڑکوں کا بیٹھا دوڑتا ہوا آیا۔ برہمن لڑکاسب سے آگے تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر باباؒ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ عین اسی لمحے باباؒ نے دو گلاب جامن عبدالغفار کر دیتے ہوئے کہا۔ "چھپکلی نکو کھاتے رے۔ گلاب

جامناں کھاتے، اپنار تبہ گھٹاتے جی۔" پھر وہ وہ فضل الکریم سے کہنے لگے۔ "عیباں نہیں ڈھونڈ ھتے جی، عیباں چھپاتے ابروں کو اچھابناتے، ان کے ساتھ برے نکو بنتے۔"

ان کی بے ربط باتوں کا مفہوم کوئی اور نہ سمجھ سکا۔ باباجیؒ پھر چوبے کی جانب متوجہ ہوئے۔ "مسلمان کا چھوانکو کھاتے۔ گلاب جامناں نکو کھاتے چھپکلیاں کھاتے، کیوں رے نالائق؟"

"نہیں بابا۔" چوبے کی زبان سے نکلااور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "نہیں بابا، چوبے آپ کا چھوا تو شوق سے کھائے گا۔" کہتے ہوئے عبدالغفار نے ایک گلاب جامن چوبے کو پیش کیا۔ وہ آداب بجالا یااور منہ میں رکھ لیا۔ باباؒ نے مسکراتے ہوئے عبدالغفار کی طرف دیکھا گیا مگر کچھ بولے نہیں۔

دوسرے ہندو لڑکوں نے بھی بابا کو گھیر لیااور خوشامد کرنے لگے کہ ہمارے پاس ہونے کی دعا کریں۔

"جاؤرے جاؤ نالائقو! سب پاس ہو گئے۔" انہوں نے فقط اتنا ہی کہااور تانگے پر سوار ہو کر چلے گئے۔

عثمان نے یہ تفصیل سن کر اندازہ لگایا کہ باباؒ بہت اچھے موڈ میں ہیں۔ ان سے ملنا چاہئے۔ صرف فضل الکریم نے ساتھ دیا۔ وہ ان سے ملنے چلے۔

ولی بنادو:

اسی اثنا میں باباتانگے پر سوار آتے نظر آئے۔ عثمان کے قدم رک گئے۔ باباجیؒ نے اسے اپنے ساتھ لیا۔ اور سیدھے شکر درار وانہ ہو گئے۔

محل کے احاطے میں پہنچ کر عثمان کا ہاتھ پکڑے وہ پھر مندر کی طرف گئے۔ وہاں سناٹا تھا۔ باباجیؒ کی آواز ابھری۔ "بڑا دیو گندا ہے رے۔ مکھیاں بھٹکتیں، اس کو بہلائے گا، ہے نا!"

"نہیں بابا!" عثمان کی زبان سے یوں ہی نکلا گیا۔ باباؒ نے اسے بہت غور دے دیکھا۔

"کائے کوڈرتارے۔ چل میرے ساتھ۔ ٹوٹے دھاگے بھی جڑ جاتے۔"

مندر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کٹہرے کی اوٹ سے رگھوجی اور شہر کا کوتوال جبّار خاں نمودار ہوئے۔ باباجیؒ کو دیکھتے ہی رگھوجی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مندر کے دو تین پجاری بھی نکل آئے اور ہاتھ جوڑ کر بابا کو روکنے لگے۔ باباؒ ہنس دیے اور جبار خاں سے مخاطب ہوئے۔ "ارے بڑے کتے تو کائے کو آیارے، شیر بنے گا، پنجرے میں بند ہوگا، کیا کھائے گا رے؟"

"بابا ولی بنادو!" کوتوال کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

وہ چونک کر بولے۔ "بہت بھوکا ہے رے مگر ولی تو یہ پتھر ہے۔" انہوں نے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔ جبار خاں تڑپ کر زمین پر گر پڑا۔ زبان سے اللہ ہو کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ باباؒ سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ دس منٹ اسی عالم میں گزر گئے تو رگھوجی راؤ گھبرا اٹھا۔ باباؒ نے سر کو دوبارہ جنبش دی۔ کوتوال ہوش میں آ گیا۔ لیکن آنکھیں اب بھی انگارے کی طرح سرخ تھیں اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"اب اس کا پیٹ بھرا۔ کئی دن کا بھوکا تھا جی۔ بہت بھوکا ہے۔" پھر وہ حجرے کی طرف چل دیے۔ راجہ نے رکتے رکتے کہا۔ "کوتوال صاحب کے ساتھ چیف کمشنر سر بنجمن رابرٹس آئے ہیں۔ میرے محل میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اجازت ہو تو بلالاؤں۔"

عثمان بنکٹ راؤ کے قریب بیٹھا تھا۔ پہلوان باباکی مٹھیاں بھر رہا تھا۔ راجہ کے ہمراہ بنجمن ننگے پاؤں حجرے میں داخل ہوا۔ باباجی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "ارے بندر، توکائے کو اتنا خرچہ کیا؟ بچی کو ناحق تکلیف دیا۔ بیٹا کو مٹی سونگھا دیتے رے، اچھے ہو جاتے۔"

کوئی نہ سمجھ سکا کہ بابا کیا کہہ رہے ہیں۔ عثمان کی نگاہ دروازے کی جانب اٹھی۔ جوتوں کے قریب کوتوال بیٹھا نظر آیا۔ اس پر ابھی تک لرزہ طاری تھی۔ اور آنکھوں سے اشک رواں تھا۔ وہیں رانی، سر بنجمن کی میم اور جواں سال بھتیجی کھڑی تھیں۔ بابا نے ان کو دیکھا تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ خواتین کا بڑا احترام کرتے تھے۔ رانی کو بیٹی بنا رکھی تھا اور اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔

"آجاؤ رے اندر آجاؤ۔ باہر کائے کو کھڑے ہو!" وہ ان سے مخاطب ہوئے۔ رانی نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ پھر رانی لڑکی کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھی۔ لڑکی کے سر پر پٹی بندھی تھی۔

"بابا! اس کے سر میں درد رہتا ہے۔ لندن میں کسی علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ سر بنجمن نے اسے آپ سے دم کرانے کے لئے وہاں سے بلوایا ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں پورے بات کہہ گئی۔

"یہ بندر تو پگلا ہے جی۔ بچی کو تکلیف دیا۔ تاج الدین کو بولنا تھا۔" پھر بڑے پیار سے اسے اپنے قریب بٹھایا۔ "پریشان نکو ہوتے بیٹی، مٹی سونگھ لیتے، اچھے ہو جاتے، پٹی کھول دیتے۔" شفقت اور مٹھاس ان کے لہجے سے پھوٹی پڑتی تھی۔

لڑکی نے کچھ بھی نہ سمجھا۔ وہ اردو سے ناآشنا تھی۔ حیرت بھری نگاہوں سے بابا کو دیکھ رہی تھی۔

"کون سی مٹی؟" رگھوجی نے پوچھا۔

"یہ بندر لائے گا جی۔ سڑک کی مٹی لائے گا۔ بچی کو سونگھا دیتے جی۔ اچھے ہو جاتے۔"

سر بنجمن رابرٹس باباکی خدمت میں پہلے بھی حاضری دے چکے تھے۔ بات سمجھ گئے۔ فوراً سڑک سے تھوڑی سی مٹی لے آئے اور بچی کو اسے سونگھ لینے کی ہدایت کی۔

مٹی سونگھتے ہی لڑکی کو تین چار چھینکیں آئیں اور ہر چھینک کے ساتھ اس کی ناک سے ایک کیڑا گرا۔

"بس بیٹی بس۔ اب اچھے ہو گئے۔" بابا نے پورے اعتماد سے کہا۔

رانی نے اس کے سر کی پٹی کھول دی۔ سر کا درد بالکل غائب ہو گیا۔ فرطِ مسرت سے لڑکی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ سب کے سب سراپا شکر وسپاس بنے ہوئے تھے۔ لڑکی کے اشارے پر سر بنجمن نے احساسِ تشکر کے ساتھ باباجی کی خدمت میں کثیر رقم پیش کی۔ تو ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ مگر ان کے الفاظ میں بڑی نرمی تھی۔ "تو میری بیٹی ہے۔ بیٹی باپ کو نذرانہ نہیں دیتی۔ باپ بیٹی کو دیتا ہے۔" یہ کہا اور گاؤ تکئے

کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ چند سکے لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے خوشی خوشی تحفہ قبول کر لیا اور پھر وہ شاداں و فرحاں رخصت ہو گئے۔

ادھر کوتوال جبار خاں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آ گیا۔ وہ ساری رات اللہ اللہ کی ضرب لگاتا رہا۔ دوسرے دن گھر کا سارا سامان لٹا دیا اور درویشی اختیار کر لی۔ سر بنجمن نے کچھ عرصے اسے تحفظ دیا مگر پھر کوشش کر کے وقت سے پہلے ہی پنشن دلوادی۔

احسان: لوگ نہیں جانتے کہ سی پی کے مسلمانوں کی زیادہ تر فلاح و بہبود و حضرت تاج الدین باباؒ کی رہینِ منت ہے اور پورے صوبے پر ان کا زبردست احسان ہے۔ سر بنجمن کی یہی ملاقات مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔ انہوں نے بڑی تعداد میں اسکول اور مدرسے قائم کر کے تاج الدینؒ بابا کا فیضان عام کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی درسگاہوں کے لئے زمینیں فراہم کیں، عمارتوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور تعلیم یافتہ مسلمان جوانوں کے لئے روزگار فراہم کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبل پور کے مسلمانوں کا اسکول آج بھی رابرٹسن کالج بھی قائم کیا۔ ناگپور کا انجمنِ اسلامیہ ہائی اسکول بھی سر بنجمن اور تاج الدین باباؒ کی اسی ملاقات کی یادگار ہے۔

کالج ہاسٹل میں چھپکلی والے واقعے کے چند روز بعد امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ سارے ہندو اور تینوں مسلمان طلبہ کامیاب قرار دیے گئے۔ جن کی اس روز باباجی سے ملاقات ہوئی تھی۔ فضل الکریم، عبدالغفار اور چوبے جنھوں نے باباجی کے دیے ہوئے گلاب جامن کھائے تھے، درجۂ اول میں کامیاب ہوئے۔

نتیجے کے دوسرے ہی دن سر بنجمن نے انہیں طلب کر لیا۔ صرف فضل الکریم اور عباسی پہنچ سکے۔ عبدالغفار اور چوبے اپنے گھر جا چکے تھے۔ سر بنجمن نے ان

دونوں کو تحصیل دار مقرر کر دیا اور دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ وہ اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔

چند روز بعد عبدالغفار اور چوبے بھی پہنچ گئے۔ نائب تحصیل دار مقرر کئے گئے۔ مگر خالی جگہیں نہ ہونے کے باعث سالہاسال کی ملازمت کے باوجود تحصیلداری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ سر بنجمن کا تھوڑے ہی عرصے بعد تبادلہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے جانشیں کمشنر صاحب سے یہ کہتے گئے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔

دعا اور ترقی:

ایک شام چائے پر عبدالغفار، چوبے اور نورس بھی موجود تھے۔ چوبے ناگپور میں تعینات تھا اور عبدالغفار کو ساگر کی طرف کوچ کرنا تھا۔ للیتا نے عثمان سے کہا کہ وہ بابا صاحب سے دعا کرائے کہ ڈاکٹر چودھری کی پریکٹیس چل نکلے۔ چائے کے بعد عبدالغفار کے علاوہ سارے مرد باباجی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

بابا حجرے میں تھے اور ان پر استغراق کی کیفیت طاری تھی۔ کچھ دیر بعد وہ عالمِ حواس میں آ گئے۔ عثمان پر نگاہ پڑتے ہی ان کا چہرہ شاداب ہو گیا۔ "ارے عثمان! تو اتنے دن سے کیوں نہ آیا؟ دیوتا میلا ہو رہانا۔ اس کو نہلاتا کائے نا۔"

وہ اٹھنے لگے اور اس روز عثمان کو رگھوجی کی جگہ لیناپڑی۔ "نہیں بابا۔ آپ بیٹھے رہیں۔ ادھر نہ جائیں۔ رگھوجی خود نہلا دیں گے۔"

"رگھوجی نکو نہلا سکتا رے۔ نکو نہلا سکتا۔ تو کائے کو ڈرتا۔ پھر کائے کو آیا رے، کائے کو آیا۔ جا اپنا راستہ لے۔"

عثمان نے پہلی بار باباکے سامنے زبان کھولی تھی۔ وہ ان کی خفگی پر گھبرا کے چپ ہو گیا۔

فضل الکریم نے بات کا رخ بدل دیا۔ "باباجی ! یہ ڈاکٹر چودھری اور نورس آپ سے ملنے آئے ہیں۔اور یہ چوبے سلام کے لئے حاضر ہوا ہے۔"

"سلام کرنے نکو آیارے۔ بولتا گلاب جامن سے پیٹ نکو بھرا۔ پیٹ میں درد ہو جائے گارے۔ چھپکلی نکو کھاتے رے۔ نکو کھائے گا عثمان ؟"

عثمان جھینپ گیا۔

"ڈاکٹر پیٹ کے درد کا علاج کرتانا۔ زیادہ کھانے سے درد ہو جاتا۔ بندر اچھارے۔ جھنڈی دکھاتا۔"

ان پر پھر جذب کا غلبہ طاری ہو گیا۔ وہ سب بت بنے بیٹھے رہے۔ پھر فضل الکریم کے اشارے پر اٹھ کر باہر آگئے۔ اس نے سمجھایا کہ اس کی بات کا جواب مل چکا ہے۔ مگر چوبے کا اصرار تھا، نہیں ایک بار پھر باباکے پاس جاناچاہئے۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ باباخود حجرے سے بر آمد ہوئے۔ وہ لوگ سہم گئے۔

"توابھی تک نہیں گیارے عثمان، باباکی بات نہیں مانانا۔"اس بار ان کا لہجہ نرم تھا۔"اور بندر توسلام کرنے آیاتھا۔تاج الدین کی دعالیتاجا۔نالائق !"

عثمان اور نورس کو وہ اپنے حجرے میں لے آئے۔"اچھابندر ہے جی،اچھاہے۔ ایمانداری سے کام کرتا۔ عثمان !اس کو جامن کھلانارے اور کیامانگتارے بندر؟"

"کچھ نہیں بابا۔"نورس نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔"بابانے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔اور پھر انہیں رخصت کر دیا۔

نورس اور عثمان گھر پہنچے۔ کھانے کی میز پر دو عدد گلاب جامن دیکھ کر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ملازم نے بتایا کہ بنکٹ راؤ کا لڑکا دے گیا ہے۔ ان کے گھر نیاز دلائی گئی تھی۔ یہ اس کا تبرک ہے۔

"نیاز کیسی! وہ تو ہندو ہے۔"

"ہندو ہونے کے باوجود ہر جمعرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیاز دلواتا ہے۔"

باباجی کی ہدایت کے مطابق عثمان نے گلاب جامن نورس کو اصرار کے ساتھ کھلا دیے کھانے کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کی ترقی کے احکام آ گئے۔ اور وہ ڈویژنل سپر نٹنڈنٹ ہو کر بمبئی چلا گیا۔

فضل الکریم ایم۔ اے۔ سی کے عہدے پر فائز ہو کر بلاسپور کی طرف کوچ کر گیا۔ بمبئی سے عثمان کی ترقی کا آرڈر آیا تو وہ پس و پیش میں پڑ گیا۔ لوگوں کا خیال تھا اسے باباسے دوری گوارا نہ ہو گی۔ اور وہ ناگپور نہ چھوڑے گا۔ مگر اس کے لئے اس تاثر کے خلاف عمل کرنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر چودھری ہنوز ترقی کی راہ تک رہا تھا۔ پھر اچانک راجہ بلاسپور کے یہاں سے اس کے لئے بلاوا آ گیا۔

گاڑی پر سوار ہوتے وقت چودھری کی نگاہ بنکٹ راؤ پر جا پڑی۔ وہی اس گاڑی کا گارڈ تھا۔ اگلے اسٹیشن پر وہ اس کے پاس آیا اور باباجی کا پیغام آیا۔ "مریض کو کھر یا کھلانا۔"

ڈاکٹر چودھری کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ تاہم وہ منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ اور مریض کو اپنے ساتھ واپس لے آیا۔ وہ راجہ صاحب کا بھتیجا اور ہونے والا داماد تھا۔ اس کے پیٹ میں اس قدر شدید درد ہوتا کہ وہ تڑپ تڑپ جاتا تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے علاج سے مایوس ہو چکے تھے۔

چودھری نے دو تین روز علاج کیا مگر مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی دوران بنکٹ راؤ نے ایک بار پھر بابا کا پیغام یاد دلایا۔ تب اس نے کھریے کا سفوف کھلانا شروع کیا اور آٹھ دس روز میں مریض مکمل صحت یاب ہو گیا۔

اس کارنامے سے چودھری کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور وہ بڑے معقول مشاہرے پر راجہ صاحب کا ذاتی معالج مقرر ہو گیا۔ تین مہینے کے اندر اندر اس کی پریکٹس اس قدر بڑھ گئی کہ سر اٹھانے کی مہلت نہ رہی۔

عثمان اس ماحول میں اجنبی نظر آتا تھا۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اور اس نے وہاں سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ ایک روز وہ فضل الکریم کے پاس بلاسپور پہنچا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا اور زبردستی اپنے یہاں ٹھہرا لیا۔

دیو کا راز:

دونوں رات بھر باتیں کرتے رہے۔ فضل الکریم نے حیرت انگیز انکشافات کئے۔ باتوں ہی باتوں میں بھوت بنگلے کا ذکر چھڑ گیا۔ فضل الکریم نے کہا۔ "میں نے اس بنگلے میں وقوع پذیر ہونے والے سارے واقعات کا کھوج لگا لیا ہے۔ تاہم ایک دو کڑیاں باقی ہیں۔ تمہیں اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتانا ہوگا۔ باباجی کی بات سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ بھونسلہ خاندان سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔"

عثمان نے اعتراف کرتے ہوئے بتایا۔ "ہمارے پر دادا نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کو تعلق چھوٹا ناگپور کے مرہٹہ خاندان سے تھا۔"

فضل الکریم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور اس نے نہایت قدیم دستاویز نکالتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ راجہ رگھوجی کی جاگیر حال ہی میں

کورٹ آف وارڈ سے واگزار ہوئی ہے۔ گورنمنٹ نے مجھے اس کا کسٹوڈین مقرر کیا اور اس سلسلے میں گزشتہ ماہ مجھے بمبئی جانا پڑا۔ رگھوجی کا محل قرضوں کی وجہ سے بحقِ سرکار ضبط ہو چکا ہے۔" فضل الکریم نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "شاید تمہیں علم نہ ہو رگھوجی کی اس وقت کوئی اولاد نہیں ہے۔ اور اس کے خاندان کے سارے افراد انگریزوں نے پہلے ہی تہہِ تیغ کر دیے ہیں۔ لیکن راج کمار روپوش ہو چکا تھا۔ اس کا سراغ نہیں مل سکا۔" یہ کہہ کر اس نے دستاویز پر ایک جگہ انگلی رکھ دی اور عثمان سے پوچھا ۔"تمہارے پردادا کا سابقہ نام یہ نہیں تھا؟"

عثمان نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "غالباً ہمارے دادی یہی نام بتاتی تھیں۔"

فضل الکریم نے تقریباً اچھل کر اپنے جذبات ظاہر کئے۔ "عثمان! تم نے بابا کی بات نظر انداز کر کے اور مندر کے بت کو غسل نہ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے ورنہ رگھوجی کے ساتھ تمہارے بھی دن پھر جاتے۔ اب تو سب کچھ ختم ہو چکا۔ افسوس!"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کریم! میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔" عثمان بھونچکا سا رہ گیا۔

فضل الکریم نے بتایا۔ "رگھوجی کے مال واسباب کی قرقی اور ضبطی کے دوران یہ دستاویز کمشنر کے ہاتھ لگی۔ اس میں یہ بھی درج تھا کہ مندر اور مہادیو کا بت کہاں ہے۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ اس نے سراغ لگالیا۔ راجکمار بالا جی فرار سے پہلے دو روز پجاریوں کے بھیس میں محل کے احاطے والے مندر کے اندر روپوش رہا۔ اس نے پہرہ بٹھا کر مہادیو کے بت کو غسل دیا۔ سیندور کی موٹی تہہ اتروا دی۔ اس سے بت کی پشت پر کھدی۔ ہوئی وہ تحریر ابھر آئی جس میں دفینے کے مقام کی نشان دہی کی گئی تھی۔"

عثمان نے دستاویز کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور اسے یاد آیا کہ اسی تحریر اور دستخط کے چند پرانے کاغذات اس نے پردادی کے صندوقچے میں دیکھے تھے۔ مگر چند ہی روز پہلے گھر کی صفائی کرتے وقت وہ سب کباڑیے کو بیچ دیے تھے۔

فضل الکریم نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ اب تم اپنا استحقاق ثابت نہیں کر سکتے۔ میری تمام کوششیں بے کار گئیں۔ میں نے تمہاری خاطر یہ دستاویز ریکارڈ سے اڑا کر اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ حالانکہ یہ بڑا سنگین جرم ہے۔" پھر اس نے دستاویز کو پُرزے پرزے کرتے ہوئے کہا۔ "اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس مرحلے پر بنگلے کا راز بھی بتایا جا سکتا ہے۔"

اور پھر حجاب در حجاب پردے اٹھنے لگے۔

"بھوت بنگلہ ہرگز آسیب زدہ نہ تھا۔ تم نے جو سانپ مارے تھے وہ ناگ تھا۔ دراصل رات کی تاریکی میں وہ چھت گیری اور چھپر کے درمیانی خلا میں گھس جاتے اور وہاں بسنے والے پرندوں کے انڈے بچے کھا جاتے ۔ پرندے شور مچاتے اور چیخ کر اڑ جاتے۔ رات کے سناٹے میں ان پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ، گرنے کی پھٹا پھٹ اور ملی جلی چیخ پکار کا شور گونجتا تو ماحول اور بھیانک ہو جاتا۔ بھوت پریت، واہمہ پہلے ہی ذہن پر مسلط تھا۔ اس لئے چھوٹے موٹے ہنگامے کچھ اور ہی صورت اختیار کر لیتے تھے۔

اللہ اللہ کر کے بیٹھ جاؤ: مدراس کے رہنے والے ویواجی راؤ پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھے، ان کا کہنا ہے: ایک دن میں سی آئی ڈی سب انسپکٹر عبدالکریم صاحب کے گھر گیا۔ ان کے ہاں کسی بزرگ کی دو تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے پوچھا "جناب! کیا یہی حضرت باباتاج الدینؒ ہیں۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے عبدالکریم سے ایک فوٹو اپنے لئے بھی مانگا۔ لیکن انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ایک ماہ بعد میں بابا

صاحب کے پاس جاؤں گا۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلنا۔ میں نے ان سے ریل کا خرچ دریافت کیا تو انہوں نے بتایا، پچاس روپئے۔ میں نے مایوسی سے کہا کہ پچاس روپئے تو میری تنخواہ ہے۔ اگر میں پچاس روپئے سفر خرچ پر صرف کردوں تو گھر والوں کو کیا دوں گا۔ عبدالکریم صاحب نے کہا تو پھر باباصاحب کے پاس کیسے جاؤ گے؟ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے جواب دیا، میں پولیس میں ہوں۔ گورنمنٹ مجھے ڈیوٹی پر ناگپور بھیجے گی تو باباصاحب کے درشن کا موقع مل جائے گا۔ عبدالکریم صاحب نے کہا۔ "تمہاری نوکری مدراس میں مستقل ہے تمہیں ناگپور پر کس طرح بھیج دیا جائے گا؟ میں نے کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے میں بابا صاحب کے درشن کروں۔ اگر میرا جذبہ صادق ہے تو باباصاحب خود مجھے بلائیں گے۔

اس واقعہ کو چند روز گزرے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے سالانہ جلسہ کے لئے ناگپور کا انتخاب کیا گیا۔ افسر بالا نے عبدالکریم صاحب کو حکم دیا کہ وہ مجھے ساتھ لے کر ناگپور جائیں ۔ عبدالکریم صاحب نے مجھے اس سرکاری حکم سے لاعلم رکھ کر کمشنر کو رپورٹ دی کہ یہ ہیڈ کانسٹبل (یعنی میں) میرے ساتھ جانے کے قابل نہیں ہے۔ کیوں کہ اسے اختلاجِ قلب کی شکایت ہے۔ لمبے سفر اور محنت کی وجہ سے یہ کام کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ کمشنر صاحب اس درخواست پر بہت ناراض ہوئے اور سختی سے کہا کہ کچھ بھی ہو، یہی ہیڈ کانسٹبل تمہارے ساتھ جائے گا۔

ہم ناگپور پہنچ کر کانگریس کے جلسے میں شریک ہوئے اور ڈیوٹی انجام دینے لگے۔ ایک دن مجھے دل کی شدید تکلیف اٹھی۔ میں نے پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں عبدالکریم صاحب سے کہا کہ آپ مجھے مدراس روانہ کریں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، کل

چلے جانا۔ میں اگلی صبح اٹھاتو خیال آیا کہ کتنی بد قسمتی کی بات ہے کہ میں باباصاحب کے درشن کا آرزومند تھااور اس کے لئے جان کی بازی لگا کر ناگپور بھی آگیا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ میں بغیر ملے واپس جارہاہوں۔ پھر سوچا کہ ریل ۱۲ر بجے روانہ ہو گی اور سنا ہے کہ باباصاحب تانگے پر بھی باہر نکلتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ راستے میں ان سے ملاقات ہو جائے۔ ابھی میں باہر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ شور اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب تانگے پر بیٹھے آرہے ہیں اور ساتھ میں لوگ دوڑ رہے تھے۔ میں نے باباتاج الدینؒ کو پہچان لیا۔ دل میں شدید درد اٹھااور قریب تھا کہ میں گرپڑوں باباصاحبؒ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ٹھہر جا!" میں رک گیا۔ گاڑی آگے چلی گئی اور میں گھر لوٹ گیا۔ میں عبدالکریم صاحب کا انتظار کرتارہا کہ وہ آئیں تو میں ان کے ساتھ اسٹیشن جاؤں لیکن وہ نہیں آئے اور میری گاڑی چھوٹ گئی۔ تین بجے کے قریب میں دوبارہ باباصاحبؒ کے درشن کا نکلا۔ آپ دوبارہ تانگے میں سوار آئے۔ میں نے باباصاحبؒ کے چہرے پر نظر ڈالی توان کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے سوچا نہ جائے کیا وجہ ہے کہ باباصاحبؒ نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ باباصاحب نے آنکھیں کھول کر فرمایا۔ "ارے، ہورے ہو جائے گا۔ اللہ اللہ کر کے بیٹھ جا، نوکری چھوڑ دے۔" میرے دل میں خیال آیا کہ اگر نوکری چھوڑدوں تو گزر بسر کیسے ہو گی۔ باباصاحبؒ نے کہا۔ "ارے کیا پیٹ لگا یارے۔ تجھے پاؤ پیٹ گنجی دیار کھ لے کر اللہ اللہ بول کر گزار دے۔"

میں نے سوچا، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ دل کی حالت خطرناک ہے۔ میں تو ایک مہینہ شاید ہی زندہ رہوں۔ بس یہ آخری دن اللہ اللہ کر کے گزار دینے چاہئے۔

باباصاحبؒ نے ارشاد فرمایا: "ارے ان باتوں کا کیوں خیال کرتارے، جا اللہ اللہ کر۔"

میں مدراس واپس آکر چھ سال تک نوکری میں رہا اور پھر پنشن پاکر اللہ اللہ کررہاہوں۔اب نہ میرے دل میں درد ہے اور نہ کوئی دوسری شکایت ہے۔

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ایسے لوگ جن کی قوتِ فکر ومشاہدہ تیز ہوتی ہے اور جو حساس طبیعت رکھتے ہیں، اکثر شاعرانہ صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ شاعری ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے طویل مشکل اور گہرے مضامین کو مختصر طورپر اور آسانی سے دوسرے تک پہنچایا جاسکتاہے۔ جس بات کے لئے نثری صورت میں کئی صفحات درکار ہوتے ہیں۔ شعری لباس میں اسے چند مصرعوں میں مقید کیاجاسکتاہے۔

اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے حالات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتاہے کہ ان میں اکثر حضرات شاعرانہ اندازِ بیان پر قدرت رکھتے تھے۔تاریخ تصوّف ایسے کتنے ہی عظیم المرتبت لوگوں کی امین ہے جو عرفان وآگہی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔

حضرت باباتاج الدین اولیاءؒ نہ صرف شاعرانہ ذوق کے حامل تھے بلکہ شعر گوئی کی صلاحیت مدرجۂ کمال ان کے اندر موجود تھی لیکن بے نیازی اور مزاج میں استغراق کی وجہ سے آپ مروجہ طرزوں میں شاعری کی طرف رجوع نہیں ہوئے۔ جو کچھ باباصاحب نے کہااس کو نہ خود ضبطِ تحریر میں لائے اور نہ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ کوئی اور سن کر لکھ لیتا۔ صرف چند اشعار ریکارڈ میں آسکے۔ باقی کلام لاعلمی اور عدم دستیابی کے اندھیروں میں گم ہوکر رہ گیا۔ باباتاج الدینؒ داس ملوکؔ کا تخلص کرتے تھے جس کے معنی خدا کابندہ ہے ۔ذیل میں ہم باباتاج الدینؒ کے اشعار اور ان کے معانی اور مختصر تشریح پیش کررہے ہیں تاکہ قارئین کواشعار کی معنویت سمجھنے میں مدد ملے۔

۱)اجگر کریں نہ چاکری پنچھی کریں نہ کام

داس ملوکا کہہ گئے، سب کے داتا رام

ترجمہ: چوپائے ملازمت نہیں کرتے اور پرندے کاروبار نہیں کرتے پھر بھی رزق ان کو ملتا رہتا ہے۔ داس ملوکا (باباتاج الدین) کا کہنا ہے کہ دوستو! سب کی پرورش کرنے والا اللہ ہے۔

۲) مانُس ہے سب آتما، مانُس ہے سب راکھ
بِندی کی گنتی نہیں، بِندی میں سولاکھ

ترجمہ: آدمی سب کا سب روشنی (آتما) ہے اور سب کا سب مٹی (راکھ) بھی ہے۔ صفر اگرچہ شمار نہیں کیا جاتا لیکن صفر ہی سے گنتی کی قیمت لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔

تشریح: باباصاحب آدمی کو محض مٹی (گوشت پوست) سے مرکب تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی بظاہر مٹی معلوم ہوتا ہے لیکن مٹی کے ساتھ ساتھ وہ روشنیوں کا مجموعہ بھی ہے۔ ایسا مجموعہ جو کائنات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مایوس کن بات ہے کہ انسان نے خود کو مظاہر (مٹی) کا پابند بنا رکھا ہے۔ اگر انسان اپنی ذات (روشنی) سے واقف ہو جائے تو مظاہر (اسپیس) کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اپنی مرضی اور اختیار سے مظاہر میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ یہی عرفانِ نفس ہے۔

۳) دام وڈر کی رِیس میں رام کرت گن گائے
پربھو کی سوگند ہے دُشٹ اسے مل جائے

ترجمہ: ظاہر پرست خدا کی تسبیح اور عبادت کا دکھاوا کرتا ہے۔ اللہ کی قسم! اس کو اللہ تو نہیں مل سکتا، البتہ شیطان اسے مل جاتا ہے۔

۴) تن پاپی، من کاہرہ، اجیارے سب کیس
مندر کا دیپک نہیں، رشیوں کا سا بھیس

ترجمہ: جسم گناہوں سے آلودہ ہے، دل سیاہ ہو چکا ہے مگر ان چیزوں کو سفید بالوں نے چھپا رکھا ہے۔ محض اللہ والوں کا حلیہ بنا لینے سے یا ان کے جیسا لباس پہن لینے سے دل کے اندر روشنی نہیں ہو سکتی۔

۵) سائے بن کی رات میں بن باسی بن جائیں
داس ملوکا ساتھ میں جاگیں اور لہرائیں

ترجمہ: جنگل کی رات میں سائے آدمی بن جاتے ہیں۔ داس ملوکا (تاج الدین) ان کے ساتھ جاگتے رہتے ہیں اور خوش گپیاں کرتے رہتے ہیں۔

تشریح: یہ دوہا اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب باباصاحب رات کو ریاضت و مراقبہ کی غرض سے بابا داؤد مکیؒ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ باباصاحب کہتے ہیں کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مظاہر بے حس و حرکت ہیں اور ان میں زندگی نہیں ہے لیکن در حقیقت ان میں زندگی کے تمام آثار موجود ہیں۔ شب بیداری کی وجہ سے موجودات کا باطنی رخ سامنے آجاتا ہے اور تاج الدین رات بھر غیبی مشاہدات میں مستغرق رہتے ہیں۔

ماہِ ذیقعد ۱۳۴۳ھ میں بابا معمول کے مطابق گھومنے نکلے اور ڈگوری کے پل پر بیٹھ گئے۔ حاضرین بھی آپ کے قریب بیٹھ گئے اور اپنی اپنی مشکلات بیان کرنے لگے۔ باباصاحب حضرت فریدالدین تاجی سے مخاطب ہوئے۔

تاج العارفین، سراج السالکین، تاج الملوک، جانتے ہو یہ کون ہے؟
فرید صاحب نے جواب دیا۔ "آپ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔"
باباصاحب نے فرمایا۔ "ہو بابو۔"
ایک لمحہ توقف کے بعد باباصاحب نے پوچھا۔ "عید کا چاند دیکھا گیا؟"
عرض کیا گیا۔ "رمضان کی عید ہو چکی۔ اب عید الضحیٰ کا چاند دکھے گا۔"

اسی ماہ باباصاحب کی طبیعت قدرے خراب ہوئی جس کی وجہ سے آپ باہر تشریف نہیں لائے۔ایک دن صبح باباصاحب نے شکر درہ کا وہ گھنٹہ کھولا جو مہاراجہ رگھو جی کے پہرے دار بجایا کرتے تھے۔اور کہا۔

"یہ گھنٹہ تاج آباد میں بجے گا۔"

تاج آباد اس زمانے میں ایک غیر آباد اور ویران جگہ تھی جو امریڈ روڈ پر واقع تھی۔اس جگہ چند جھونپڑے اور پھونس کی ایک مسجد تھی۔حضرت فریدالدین صاحب کی ایماپراس زمین کا نام تاج آباد تجویز ہوا تھا۔

شکر درہ سے باباصاحب تاج آباد پہنچے۔اور پھونس کی مسجد میں بیٹھ گئے۔کھانا طلب کیااور کچھ کھا کر وہاں سے بیر پیٹھ کی طرف روانہ ہوئے۔چلتے چلتے ایک میدان میں بیٹھ گئے۔مٹھی بھر مٹی اٹھائی سونگھااور فرمایا۔

"حضرت ! یہ مٹی بہت اچھی ہے۔ہمارے لئے یہاں بنگلہ بنادیجئے تو رہیں گے۔"پھر فوراًہی فرمایا۔

"نکورے چپ، جھونپڑا رہا تو بس۔"

باباصاحب کی طبیعت گاہے بہ گاہے خراب رہنے لگی۔آپ کا معمول تھا کہ عیدین کو شہر کی طرف ضرور جاتے تھے۔خدّام باباصاحب کو قیمتی جبّہ پہناتے اور آپ عمامہ باندھتے۔اس کے بعد آپ تانگے پر سوار ہو کر ناگپور کی گلی گلی اور سڑکوں پر گھومنے اور لوگوں کو دیدار سے مشرف کرتے۔اس طرح لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔بابا صاحب کی سواری کو دیکھ کر لوگ دوڑے ہوئے آتے اور سلام عرض کرتے۔مشتاقان دید کی پیاس نہ بجھتی تو تانگے کے ساتھ دوڑتے جاتے۔باباصاحب اپنے مخصوص لہجے میں لوگوں سے گفتگو کرتے رہتے۔

اس دفعہ بقرہ عید کا چاند ہوا لیکن روایت کے خلاف باباصاحب نے لوگوں کی بہت کوشش اور عرض کے باوجود نہ نیا کپڑا پہنا اور نہ شہر کی جانب گئے۔ نہ صرف عید الضحیٰ کے دن بلکہ اس کے بعد پورے مہینے باباصاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں رہی۔ آپ کبھی باہر جاتے اور کبھی نہیں۔

محرم ۱۳۴۴ھ آگیا۔ باباصاحب کا معمول تھا کہ محرم کی دس تاریخ کو سبز جبّہ زیب تن کر کے شکردرہ سے باہر ایک میدان میں تشریف لے جاتے جو میدانِ کربلا کہلاتا تھا۔ میدانِ کربلا کی یہ حاضری نہایت شان اور دبدبے کی ہوتی تھی۔ سب سے آگے مہاراجہ رگھوجی راؤ ہاتھی پر سوار ہوتے۔ اور ان کے آگے پیچھے سپاہی ہاتھ میں نیزے لئے ساتھ چلتے۔ مہاراجہ کی سواری کے پیچھے حضور باباصاحب کی بگھی ہوتی تھی جس کے ساتھ دو نشان بردار چلتے تھے۔ باباصاحب کی سواری کے ساتھ ان کے بچوں، میں سے جناب محمد حسین صاحب، خواجہ علی امیر الدین صاحب اور جناب خواجہ قادر محی الدین صاحب کی سواریاں ہوتی تھیں۔ باباصاحب کی بگھی کے اطراف عقیدت مندوں اور ان سے روحانی تعلق رکھنے والے حضرات کا ہجوم ہوتا تھا۔ یہ جلوس میدانِ کربلا گھوم کر واپس ہو جاتا تھا۔

دس محرم الحرام ۱۳۴۴ھ کو روایت کے مطابق باباصاحب جلوس کے ساتھ میدانِ کربلا کی طرف چلے۔ شکردرہ سے نکل کر کچھ دور پہنچے تو آپ نے وزیر نامی نشان بردار کے ہاتھ سے نشان لے کر خود اٹھالیا اور یہ شعر آپ کی زبان پر جاری ہو گئے۔

امامِ دیں سلطانِ مدینہ شاہوں کے سردار حسینؓ

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس وقت باباصاحب کی عجیب شان تھی۔ آپ کے اندر حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت حسینؓ کا عکس نظر آرہا تھا۔ باباصاحب کی

نسبتِ حسینی کو دیکھ کر لوگ بے اختیار قدم بوسی کر رہے تھے۔ ہزاروں افراد کا مجمع ساتھ تھا۔ اور لوگ دیکھ رہے تھے کہ باباصاحب کا دریائے عطا جوش میں ہے، جو جاتا ہے اسے عطا کا مژدہ سناتے ہیں۔

محرم کی ۱۶ ؍تاریخ کو باباصاحب قدرے بخار میں مبتلا ہوئے۔ مہاراجہ رگھوجی اور دیگر جاں نثار متفکر ہوگئے۔ کیونکہ ادھر دوماہ سے باباصاحب نے کچھ تشویشناک اشارے دینے شروع کردیئے تھے۔ مہاراجہ نے کئی ڈاکٹر باباصاحب کی خدمت میں مقرر کر دیئے اور باباصاحب کے عقید تمند حکیم ظفر حسین صاحب بھی ہمہ وقت باباصاحب کے پاس موجود رہنے لگے۔ باباصاحب کے معتقد ڈاکٹر چولکر صاحب بھی آئے۔ انہوں نے باباصاحب کو دیکھا اور کہا کہ مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کا علاج کیا جائے۔ تمام کوششوں کے باوجود باباصاحب کی طبیعت روز بروز گرتی گئی۔

باباصاحب کی طبیعت کا رجحان اور طرزِ عمل دیکھ کر مہاراجہ رگھوجی نے ارادہ کیا کہ تمام لوگوں کو باباصاحب سے ملنے کے لئے بلالیں۔ باباصاحب نے بھی مہاراجہ کو حکم دیا کہ عام اعلان کر دیا جائے کہ ہر شخص ملاقات کے لئے آسکتا ہے۔

۲۶ ؍محرم کا سورج طلوع ہوا۔ آج جاں نثاروں اور خادموں کو باباصاحب کے انداز و اطوار بدلے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اور یہ تبدیلی ان کے لئے اضطراب کا باعث بنتی جارہی تھی۔ اسی اضطراب و تشویش کے عالم میں دن ڈھل گیا اور مغرب کا وقت قریب آگیا۔ باباصاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ چاروں طرف لوگ موجود تھے۔ سب کی بے چین اور بے قرار نظریں باباصاحب کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ یکایک باباصاحب پلنگ سے اٹھے اور حاضرین پر مشفقانہ نظر ڈالے۔ پریشان اور دل گرفتہ

جاں نثاروں کو تسلی آمیز کلمات سے مخاطب کیااور ہاتھ اٹھا کر سب کے لئے دعا کی۔ آپ کی اندازِ تخاطب بدلا ہوا تھا۔

دعااور کلماتِ تسلی و تشفی کے بعد باباصاحب پلنگ پر لیٹ گئے اور ایک بلند آویز گہری سانس کے ساتھ ہی آپ کی روح پر فتوح نے جسم خاکی سے رشتہ منقطع کر لیا۔

اِنَّااِللّٰه وَاِنَّااِلَیْهِ رَاجِعُون

یومِ وصال پیر تھا۔ تاریخ ۲۶؍ محرم الحرام ۱۳۴۴ ھ ، بمطابق ۱۷؍ اگست ۱۹۳۵ ء تھی۔

یہ حادثہ حاضرین کے دل پر بجلی بن کے گرا۔ ان کے دل کی دنیا زیروزبر ہوگئی۔ آنکھیں بے اختیار آنسو برسانے لگیں۔ باپ سے زیادہ مشفق اورماں سے زیادہ مہربان ہستی کی جدائی ان کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔

باباصاحب کے وصال کی خبر محل سے نکل کر شکر درہ میں پہنچی اور جنگل کی آگ کی طرح سی پی اور برار میں پھیل گئی۔ پورا ناگپور ماتم کدہ بن گیا۔ ہر مذہب اور ملت کے لوگ جوق در جوق اپنے بابا کے آخری دیدار کے لئے آنے لگے۔ چوبیس گھنٹے تک لوگ زیارت کرتے رہے لیکن پھر بھی لوگوں کا ہجوم کم نہ ہوا۔ لوگ پروانہ وار جنازے کا طواف کر رہے تھے اور یوں رو رہے تھے جیسے ان کے ماتھوں پر یتیمی کا داغ لگ گیا ہو۔

مدفن کے لئے وہی مقام منتخب کیا گیا جس کی مٹی زمانۂ حیات میں باباصاحب نے سونگھی تھی۔ جنازۂ مبارک کو تمام شہر میں گھمایا گیا۔ مہاراجہ کے محل سے سرس پیٹھ، جمعہ دروازہ، گانجہ کھیت، اتوارا ہوتا ہوا جنازہ تاج آباد لایا گیا۔ تقریباً تیس ہزار افراد پروانہ وار جنازے کے ساتھ تھے۔ نمازِ جنازہ مولوی محمد علی صاحب نے پڑھائی جو امراؤتی میں مدرس تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے باباصاحب کو جنازے کے باہر کھڑے دیکھا۔

ہندوستان کے اخبارات نے باباصاحب کے وصال کی خبر کو جلی حرفوں سے شائع کیااور تبصرے لکھے۔

بجنور کے اخبار "مدینہ "نے ۱۳؍ دسمبر ۱۹۴۵ ءکوحضور باباصاحبؒ کی وفات پراس طرح اظہارِ خیال کیا۔

"حضور کی زندگی میں لوگ دور دور سے آپ کی زیارت کیلئے آتے تھے۔ جو شخص حاجت مند آتا، حضورؒ حق تعالیٰ سے اس کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کی دُعا فرماتے۔ کثرت سے عقیدت منداور مریض، کوڑھی، اپاہج، آسیب زدہ اور دیگر قسم کے حاجت مند آپ کی امداد کے خواہاں دربار میں پڑے رہتے تھے۔ ہر آدمی آپ کے وجود سے فیض باطنی وظاہری حاصل کرتا۔ ہر وقت لنگر خانہ جاری رہتا تھا۔ صدہا غریب ومسکین، یتیم ویسیر کی پرورش کاسامان دربار میں موجود تھا۔"

آندھراپتریکانے ۲۲؍اگست ۱۹۲۵ ءکولکھا۔

" رام ایک جنم میں آکر چلا گیا اور اب تاج الدین باباکے جنم میں آیا تھا جو ۱۷؍اگست ۱۹۲۵ ءکواس دنیاسے چلا گیا۔اور دنیانےافسوس کہ پہچانانہیں۔"

حضرت باباصاحبؒ ایک صاحبِ اختیار ولی تھے۔ ان کی کرامات اور فیوض و برکات ان کے پردہ فرمانے کے بعد بھی جاری وساری ہیں۔ چنانچہ ٹائمز آف انڈیااپنی ایک اشاعت میں رقم طراز ہے:

"ناگپور سے ایک عجیب واقعے کی خبر آئی ہے۔ بیان کیاجاتاہے کہ ایک شخص جو کچھ عرصہ قبل موٹر کے حادثے میں لنگڑاہو گیا تھااور ناگپور ریلوے اسٹیشن کے قریب بھیک مانگ کر اپناپیٹ بھرتا تھاوہ صرف ایک رات میں صحت یاب ہو گیا۔اس شخص نے

ہمارے نامہ نگار کو بتایا کہ اس نے گزشتہ ماہ ناگپور کے ایک مسلمان بزرگ کے مزار پر حاضری دی اور پانی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگیں۔ لیکن کئی ہفتے کی مدت گزر جانے کے بعد بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔اس کے بعد اس شخص نے بددلی اور مایوسی کے ساتھ حضرت باباصاحبؒ پر شدت سے لعن طعن کیا۔رات کو اس شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضرت باباصاحبؒ سفید عمامہ پہنے ہوئے تشریف لائے اور اس لنگڑے کو حکم دیا کہ سیدھا کھڑا ہو جائے۔لنگڑا آن کی آن میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہمارے نامہ نگار کا بیان ہے کہ ناگپور میں متعدد اشخاص موجود ہیں جو اس واقعے کی تصدیق کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ شخص مذکور اپنے لنگ کی وجہ سے اس ہفتے تک زمین پر رینگتا پھرتا ہے۔

ہر سال باباتاج الدینؒ کا عرس ۲۶ محرم سے شروع ہو کر ۲۹ محرم تک جاری رہتا ہے۔ ناگپور کے علاوہ بہت سے دوسرے مقامات پھر بھی آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔ ناگپور میں آج بھی صندل شریف ان ہی راستوں سے گزار کر تاج آباد لایا جاتا ہے جن سے بابا کا جنازہ لے جایا گیا تھا۔ عرس میں ہزارہا عقیدت منداور زائرین بلا تفریقِ مذہب وملت شریک ہوتے ہیں۔

تاج آباد جانے سے پہلے زائرین شکردرہ حاضر ہوتے ہیں جہاں باباصاحبؒ کی چلہ گاہ مشہور ہے۔ شکردرہ میں حاضری کی وجہ سے باباصاحب کا وہاں سے گہرا تعلق اور ان کا مہاراجہ رگھوجی راؤ سے یہ فرمان ہے کہ میرا بستر تیرے گھر سے لاکھوں برس نہیں اٹھ سکتا۔

۲۶ محرم کی شام شکردرہ میں بھی عرس منایا جاتا ہے۔ یہاں سے صندل شریف نکل کر راجہ صاحب کے محل میں جاتا ہے اور پھر واپس شکردرہ کی چلہ گاہ میں لے جایا جاتا ہے۔

قاضی امین الدین جو مہاراجہ رگھوجی کے ہاں ملازمت کرتے تھے، بیان کرتے ہیں کہ باباصاحب کے وصال کے دسویں روز تاج آباد گیا اور مزار سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر باباصاحبؒ سے کہا۔ "آپ شکردرہ سے تاج آباد آ گئے۔ اس لئے بہت سے لوگ یہاں آ کر رہنے لگے ہیں۔ میں آپ کے حکم سے مہاراجہ کے ہاں ملازم ہوا تھا۔ اگر اجازت دیں تو میں بھی تاج آباد آ جاؤں۔"

ابھی میں عرض پیش کر رہا تھا کہ حضرت اللہ کریم (باباصاحب کے فیض یافتہ) میرے پاس آئے اور فرمایا۔ "تجھے بنگلے میں رہ کر راجہ کو سلام کرنے کا حکم ہے۔ لال بنگلے سے ابھی اللہ کا پیاراا ٹھا نہیں ہے۔"

(لال بنگلے سے مراد شکر درہ کا وہ محل ہے جہاں باباصاحب کا قیام تھا)۔

فیض اور فیض یافتگان

باباتاج الدینؒ ناگپوری علوم وفیوض کا ایسا سمندر ہیں جس سے ہزاروں لاکھوں افراد اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیض یاب ہوئے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو، پارسی، عیسائی، سکھ، سب دربار تاج الاولیاءؒ میں حاضر ہوتے اور ظاہری و باطنی ہر قسم کے فیض ونعمت کے موتی چنتے۔ سالکین، متلاشیانِ حق اور طالبین سب کی دلی مراد باباصاحبؒ کی ایک نظر میں برآئی۔ باباصاحبؒ کا ارشاد ہے، میں سوالاکھ ولی بناؤں گا۔ فیض کی یہ تقسیم اس وقت بھی جاری تھی جب آپ اس مادی دنیا میں جلوہ افروز تھے اور اب بھی جاری ہے جب آپ پسِ پردہ موجود ہیں۔ باباصاحبؒ کا یہ بھی فرمان ہے کہ آج تک کسی سے پانچ پیسے نہیں بنے، میں پانچ پیسے بناؤں گا۔ میرا نام تاج الدین ہے۔

باباتاج الدینؒ کے ہاں مروجہ طرزوں میں بیعت وارشاد کا طریقہ رائج نہ تھا۔ لوگ حاضر ہوتے اور باباصاحب جس کے لئے جو ضروری سمجھتے اس کو تلقین کر دیتے۔ کسی کو کم کھانے کا حکم ہوتا تو کسی سے کہا جاتا کہ خوب کھاؤ۔ کسی کو خلوت نشیں کر دیتے اور کسی کو جلوت میں رہنے کے لئے ارشاد فرماتے۔ باباصاحبؒ کی روحانی توجہ اور نگہداشت میں جو مادرانہ اور پدرانہ شفقت و محبت کا عنصر موجود تھا اس کے پیش نظر باباصاحبؒ کے فیض یافتگان کو باباصاحبؒ کے بچے کہا جاتا تھا۔

باباصاحبؒ کے فیض یافتگان کا تذکرہ بالواسطہ باباصاحب کا تذکرہ ہے۔ ان تذکروں میں باباصاحب موجود ہیں۔ان کا مخصوص طرزِ تخاطب، طریقۂ تعلیم اور تصرف موجود ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق باباصاحب نے کچھ ایسے فقرے ارشاد فرمائے جن سے ان کی روحانی قدر و منزلت کا اظہار یا باباصاحبؒ سے ان کے روحانی تعلق کا اشارہ ملتا ہے۔ فیض یافتگان کہ فہرست میں ان درویشوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جو باباصاحبؒ کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ کتنے ہی باسعادت ایسے بھی ہیں جو عوام کے سامنے نہیں آئے اور خاموشی سے اپنا کام کرکے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قلندر بابااولیاءؒ کے ارشادات سے پتہ چلتا ہے کہ باباتاج الدینؒ کے زمانۂ حیات میں دو ہستیاں ایسی تھیں جنہیں باباصاحبؒ سے خصوصی روحانی نسبت حاصل ہوئی۔ ایک حضرت انسان علی شاہؒ اور دوسرے مریم بی اماںؒ۔

حضرت انسان علی شاہ

حضرت انسان علی شاہؒ باباتاج الدینؒ کے فیض یافتگان میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے اور آپ کے سوچنے کی طرزیں بھی باباصاحبؒ سے ملتی تھیں۔

انسان علی شاہ کی عمر ایک ماہ تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد کی کفالت نانا اور نانی نے کی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے ایک رشتہ دار سے حاصل کی جو نہایت عالم وفاضل تھے۔ انسان علی شاہ کی طبیعت میں بچپن ہی سے عبادت اور ریاضت کا ذوق وشوق موجود تھا۔

انسان علی شاہ ایک صاحبِ حیثیت شخص تھے۔ آپ کئی گاؤں کے مال گزار تھے۔ لباس نہایت نفیس اور قیمتی پہنتے اور اعلیٰ نسل کا گھوڑا سواری میں رہتا تھا۔ متمول اور بلند حیثیت ہونے کے باوجود نہایت بااخلاق ومنکسر المزاج تھے۔ آپ نے اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوائی تھی اور اس کی امامت بھی خود کرتے تھے۔ مہمانوں اور مسافروں کی خاطر تواضع کرکے آپ کو بہت خوشی ہوتی تھی۔

ابھی انسان علی شاہ ۲۲ برس کے تھے کہ آپ کی طبیعت میں تیزی سے تغیر رونما ہوا اور جذب واستغراق غالب ہوگیا۔ عالمِ جذب میں آپ لوگوں کو مارنے دوڑتے۔ دماغی مریض سمجھ کر ان کا علاج کرایا گیا اور جب حالت نہیں سنبھلی تو طے پایا کہ ان کو بزرگوں کے مزارات پر لے جایا جائے____________۔ چار چھ آدمی انسان علی شاہ کو

لے کر ہندوستان کی مشہور درگاہوں پر گئے۔ آپ جس مزار پر جاتے، اندر داخل ہوتے ہی باہوش اور مؤدب ہو جاتے۔ فاتحہ پڑھ کر مزار سے باہر آتے ہی آپ کا ہوش جذب میں تبدیل ہو جاتا۔ تمام مزاروں پر حاضر ہو کر جب انسان علی شاہ اپنے گاؤں لُنتر الائے گئے تو لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس زمانے میں بابا تاج الدین کا شہرہ ہر طرف پھیل رہا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ اب تو باباصاحب کا دربار ہی باقی بچا ہے، وہاں بھی کوشش کر کے دیکھ لینا چاہئے۔ چنانچہ وہ لوگ انسان علی شاہ کو لے کر شکردرہ پہنچے۔ انسان علی شاہ کو جب باباصاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا تو باباصاحبؒ نے فرمایا۔

"ارے، یہ تو بڑے صاحب ہیں۔ روشن چراغ ہیں۔ میرے بعد سی پی کے بادشاہ ہوں گے۔ ان کی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں توڑ دو۔ اب ان سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

حسبِ حکم بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کھول دی گئیں لیکن اب انسان علی شاہ پر جذب و بیخودی کے بجائے سکون اور ہوش کا غلبہ تھا۔ کچھ عرصہ بابا تاج الدین کی خدمت میں رہنے کے بعد انسان علی شاہ اپنے وطن چلے گئے اور آپ سے کرامات ظاہر ہونے لگیں۔ انسان علی شاہ کے اندر بابا تاج الدین کی جھلک نمایاں تھی۔ انداز و اطوار میں بھی بابا صاحب سے مشابہت رکھتے تھے۔

قلندر بابا اولیاءؒ سے روایت ہے کہ جب انسان علی شاہ سے بابا تاج الدینؒ نے یہ فرمایا کہ اگر تم ناگپور سے مدراس تک بھیک مانگتے جاؤ اور واپس آؤ تو میں تمہاری بیعت کر لوں گا۔ انسان علی شاہ جیسے صاحبِ ثروت اور ذی جاہ شخص نے بابا صاحب کے حکم پر پورا پورا عمل کیا اور باباصاحب کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ بابا تاج الدینؒ نے آپ کو 'انسان' کا نام دیا۔

مریم بی اماں

مریم بی اماں کی پیدائش ہندوستان کے قصبہ کا جلیشور تعلقہ مرتضیٰ پور ضلع اکولہ میں ہوئی۔ان کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ والد کا نام عزیزالدین اور والدہ کا نام عائشہ بی بی تھا۔ مریم بی نے قدرے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور بس۔ لیکن ذوقِ عبادت و ریاضت خوب پایا تھا۔ ان کا اکثر وقت غور و فکر اور خلوت نشینی میں گزرتا تھا۔ شادی کے بعد گھریلو مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود ان معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مریم بی کا خاندان ایک فقیر دوست خاندان تھا۔ درویشوں اور فقیروں کی خدمت میں دینا، ان کی خدمت کرنا اس خاندان کے لوگوں کو شیوہ تھا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مریم بی کے بھائی غلام محی الدین صاحب کامٹی میں ملازمت کر رہے تھے اور مریم بی بھی ان دنوں کامٹی میں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ جناب غلام محی الدین صاحب کو پتہ چلا کہ کامٹی میں ایک صاحبِ کمال اور روشن ضمیر بزرگ وارد ہوئے ہیں۔ ان بزرگ میں درویشی اور فقیری کے اوصاف دیکھ کر ایک دن غلام محی الدین صاحب نے بزرگ سے درخواست کی۔ "حضرت! کیا ہی اچھا ہوا گر آپ ہمارے گھر میں چند دنوں مہمان رہ کر غریب خانہ کو رونق بخشیں اور ہمیں اپنی خدمت کا موقع فراہم کریں۔ ہم اسے اپنی خوش بختی تصور کریں گے۔"

بزرگ نے درخواست قبول کرلی۔ ایک دن جب گھر کے سب لوگ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے مریم بی کی والدہ یعنی عائشہ بی بی سے مخاطب ہو کر کہا۔" بی بی ! اللہ تعالیٰ نے تمہیں دو لعل عطا کئے ہیں۔ اور یہ ان میں سے ایک ہے۔" بزرگ کا اشارہ مریم کی طرف تھا۔

ان بزرگ نے مریم بی کو مخاطب کیا۔"بیٹی ! آفتابِ ولایت ناگپور کے افق سے ضیاپاشی کر رہا ہے۔ جاؤ اور اپنے جسم اور روح کو اس سے منور کر لو۔ ناگپور پاگل خانہ اس وقت شہنشاہ ہفت اقلیم بابا تاج الدین کا پایہ تخت ہے۔ ان کی خدمت میں جاؤ! مشیت نے تمہاری قسمت میں حضور باباصاحب کا فیض لکھا ہے۔"

مریم بی فوراً ناگپور کے پاگل خانے میں حاضر ہوئیں جہاں ان دنوں بابا تاج الدینؒ رہتے تھے۔ مریم بی جیسے ہی وہاں پہنچیں ۔ باباصاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے قریب آکر کہا۔"ہم تو ایک عرصہ سے تیرا انتظار کر رہے تھے۔"

یہ کہہ کر باباصاحب نے مریم بی کے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں اور کہا۔"روانہ آیا کر!"

محترمہ مریم بی نے حضرت باباصاحب کی ہدایت پر اس طرح عمل کیا کہ روزانہ پاگل خانے آتیں اور پھاٹک کے باہر ایک مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر باباصاحب کی طرف متوجہ رہتیں۔ رفتہ رفتہ اس شغل میں اتنی محویت اور استغراق پیدا ہوا کہ کھانے پینے اور کپڑوں کا ہوش تک جانے لگا۔

ایک سال گزر گیا۔ اسی دوران بابا تاج الدینؒ پاگل خانے سے شکردرہ اور پھر واکی تشریف لے گئے۔ مریم بی بھی واکی تشریف لے گئیں اور قصبہ پاٹن ساؤنگی میں قیام کیا۔ یہاں

بھی وہ ہر روز حضور بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتیں جو ان پر نہایت شفقت و محبت کی نظر رکھتے تھے۔ یہ زمانہ بھی تقریباً ایک سال پر محیط ہے۔

ایک روز بابا تاج الدینؒ مریم بی کو لے کر کنہاں ندی کے اطراف میں پہنچے اور ایک ویران اور بے آباد جگہ جو جنگل جانوروں کی گزر گاہ تھی۔ وہاں پہنچ کر رک گئے اور مریم بی کو حکم دیا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ اور بلا اجازت نہ اٹھنا۔"

یہ سننا تھا کہ دل میں کسی قسم کی جھجک، خوف یا ڈر لائے بغیر مریم صاحبہ وہاں بیٹھ گئیں اور سامان خورد ونوش تک کے متعلق نہ سوچا۔ مریم صاحبہ کو وہاں چھوڑ کر بابا تاج الدینؒ واپس چلے آئے۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ باباصاحبؒ کے خدام اور عقیدت مند اس دوران سخت حیران و پریشان رہے کیوں کہ باباصاحبؒ نے ایک ہفتہ مطلق نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ایک ہفتے بعد باباصاحبؒ باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے پکارنا شروع کیا۔ " کچھمن واکوڑیا! کچھمن واکوڑیا!"

مجمع میں سے ایک شخص فوراً ہاتھ باندھے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حضور باباصاحبؒ نے اس سے فرمایا۔ "اماں مریم صاحبہ تیرے کھیت کی طرف کے جنگل میں موجود ہیں۔ تو جا اور انہیں کھانا کھلا اور خدمت کیا کر۔"

واکوڑیا نے فوراً کھانا تیار کروایا اور ساتھ لے کر اماں مریم صاحبہ کو چادر اوڑھے لیٹے پایا۔ اس نے کئی آوازیں دیں لیکن اماں مریم صاحبہ کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی اور وہ بدستور آنکھیں بند کئے چادر اوڑھے لیٹی رہیں۔

آخر میں واکوڑیا نے کہا۔ " میں باباصاحب کے حکم پر آپ کے لئے کھانا لایا ہوں۔"

مریم اماں صاحبہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں، نہایت تعظیم سے کھانالیااور بڑی مشکل سے تھوڑاسا کھایا۔لوگ کہتے ہیں کہ جس وقت واکوڑیا کھانالے کر اماں صاحبہ کی تلاش میں گیا ہے اس کے کافی دیر بعد باباصاحب نے کھانا منگوایااور ایک ہفتے کے بعد پہلا لقمہ منہ میں ڈالا۔

مریم اماں صاحبہ فرماتی تھیں کہ میری برسوں کی ریاضت کو حضور نے ازراہِ عنایت و شفقت دنوں میں طے کرایا کیوں کہ میں عورت ذات اور دبلی پتلی تھی۔اس لئے حضور نے میرے حال پر خاص رحمت کی نظر رکھی۔اور جلد ہی مجھ پر بابِ ولایت کھول دیا اور اپنی قربت میں رہنے کے لئے ارشاد فرمایا۔

مریم اماں صاحبہ کے لئے ایک جگہ مقرر کردی گئی اور واکی تشریف میں ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوگیا۔ تاج الاولیاء باباتاج الدینؒ کے فضل کی تقسیم اب مریم اماں صاحبہ کے ذریعے بھی ہونے لگی۔ باباصاحبؒ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو اماں صاحبہ کے پاس جانے کا حکم دیتے اور لوگ ان کے دربار سے بامراد لوٹتے۔حاضرین نے یہ بات محسوس کی کہ جو بات حضرت باباتاج الدینؒ اپنی نشست گاہ پر فرماتے،اس بات کا اظہار اماں صاحبہ اپنی قیام گاہ پر کردیتی تھیں۔

باباتاج الدینؒ مریم اماں صاحبہ پر جو نظر عنایت رکھتے تھے اس اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتاہے کہ باباصاحب نے تنبیہ کردی تھی کہ ان کے پاس حاضری دینے سے پہلے اماں صاحبہ کی خدمت میں حاضری دی جائے۔لوگوں نے اکثر دیکھا کہ درویش اور فقراء جو دربارِ تاج الاولیاء میں باباصاحب کے دیدار کے لئے حاضر ہوئے ان سے باباصاحبؒ اُس وقت تک نہ ملے جب تک کہ انہوں نے مریم اماں صاحبہ کے ہاں حاضری نہ دی۔لوگوں نے یہ بات بھی مشاہدہ کی کہ باباصاحبؒ مریم اماں صاحبہ کی کسی بات کو رد نہیں فرماتے تھے۔ باباصاحبؒ اماں صاحبہ کو احتراماً اپنی والدہ کے نام پر مریم بی کہہ کر پکارتے تھے اور فرمایا کہ وہ تو میری ماں ہے۔زمانۂ ریاضت میں باباصاحبؒ نے اماں صاحبہ کا نام بھائی عبدالرحیم رکھا تھا اور بعد میں گاہے بہ گاہے اسی نام سے آواز دیتے تھے۔

جب باباتاج الدینؒ واکی سے شکردرہ منتقل ہوئے تو مریم اماں صاحبہ بھی شکردرہ تشریف لے گئیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس زمانے میں آپ کو جسمِ خاکی ایک بوجھ معلوم ہونے لگا۔ ابھی شکردرہ میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرتے تھے کہ آپ نے پیرہنِ خاکی اتار پھینکا اور اس مادّی دنیا سے پردہ فرمالیا۔ یہ مورخہ ۲۷ شوال ۱۳۳۷ھ کا دن تھا۔ باباتاج الدینؒ کے حکم پر آپ کا جنازہ شکردرہ سے کامٹی لایا گیا اور گاڑھا گھاٹ پر آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

باباقادراولیاء

باباقادر کا تعلق ترچنا پلی کے نواب خاندان سے تھا جس سے بعض درویش بھی گزرے ہیں۔ نواب محمد علی آپ کے والد تھے۔ ۱۳۲۰ ھ میں ترچناپلی کے مقام پر بابا قادر کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کئے گئے لیکن تعلیم میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ البتہ اولیاءاللہ اور پیغمبروں کے قصے بہت غور سے سنتے تھے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ کی تنہائی پسندی اور محویت میں اضافہ ہوتا گیا۔ نوجوانی میں جان حسین کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ ان ہی دنوں بابا قادر کے والد کا آخری وقت آپہنچا۔ والد نے بابا قادر کو پاس بٹھا کر کہا۔ "بیٹے! تمہارے خاندان میں فقیرانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ میرے نصیب میں تو نہیں تھا لیکن تم باباتاج الدین اولیاءؒ کے حضور ناگپور ضرور حاضر ہونا۔"

والد کی وصیت کے مطابق شکر درہ باباتاج الدینؒ کے پاس پہنچے۔ باباصاحب نے دیکھتے ہی کہا۔ "شیر کا بچہ شیر ہے۔"

یہ کہہ کر پاس رکھے ہوئے کیلوں میں سے ایک کیلا اٹھا کر باباو قار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کیلا ذرا گلا ہوا تھا۔ نفاست پسند ہونے کی وجہ سے بابا قادر کی طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ کیلا کھائیں۔ انہوں نے آہستہ سے ہاتھ پشت کی طرف کر لیا۔

باباتاج الدینؒ نے فرمایا۔ "کھاؤ یا نہ کھاؤ۔ تمہیں جو کچھ پہنچنا تھا، پہنچ گیا۔"

باباتاج الدینؒ کے لئے کھانااور چائے محمد غوث باباکی جھونپڑی سے جاتا تھا۔ لنگر خانے کے منتظم حیات خاں تھے جو باباصاحب کو کھانااور چائے پہنچاتے تھے۔ ان کو اپنی اس خدمت گزاری پر بڑاناز تھا۔ انہوں نے ایک دن بابا قادر کو کلہاڑی دیتے ہوئے کہا۔ "صاحب زادے! یہاں مفت کا کھانا نہیں ملتا۔ کچھ نہ کچھ کرناپڑتاہے۔ تم لنگر خانے کیلئے لکڑیاں پھاڑا کرو۔"

بابا قادر کلہاڑی لے کر لکڑیاں پھاڑنے لگے۔ بڑے ناز و نعم میں پلے تھے اور کبھی ایساسخت کام نہیں کیا تھا۔ بمشکل آدھ گھنٹہ کام کیاہو گا کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ چنانچہ کلہاڑی رکھ کر لیٹ گئے۔

ادھر حیات خاں کھانا لے کر باباتاج الدینؒ کے پاس پہنچے تو باباصاحبؒ نے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جی! یہ حیات خاں ہم سے لکڑیاں پھڑواتاہے۔ یہ دیکھو، ہمارے ہاتھ میں چھالے۔"

لوگوں نے دیکھا کہ باباتاج الدینؒ کے ہاتھوں پر چھالے پڑے ہوئے تھے۔ باباتاج الدین اولیاءؒ اشاروں میں گفتگو فرماتے تھے۔ عالمِ جذب و کیف میں بولتے تو اہلِ نظر ہی ان اشاروں کناتوں کو سمجھتے جو گفتگو میں پوشیدہ ہوتے تھے۔ بابا قادر کو دربارِ تاج الاولیاء میں رہتے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن اس عرصے میں آپ باباصاحب کے مزاج اور افتادِ طبع کو سمجھنے لگے تھے۔

ایک مارواڑی سیٹھ اور اس کی بیوی اپنے اکلوتے بچے کو لے کر باباتاج الدینؒ کے پاس آئے۔ بچہ دن رات روتا رہتا تھا۔ اور ہر طرح کا علاج بے سود ثابت ہوا تھا۔ باباصاحبؒ کے سامنے بچہ پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ "چولھے میں ڈال دے۔"

میاں بیوی اس عجیب و غریب جملے سے مایوس اور مغموم واپس ہوئے۔ راستے میں بابا قادر ملے۔ انہیں جب بتایا گیا تو ہنس کر کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کو نظر لگ گئی ہے۔ کچھ مرچیں وار کو چولھے میں ڈال دو۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بچے کو آرام آگیا۔

باباتاج الدینؒ کی خدمت میں چند سال رہنے کے بعد بابا قادر وجے نگرم لوٹ آئے لیکن اب ان کی حالت بدل چکی تھی۔ اب آپ ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ بہت کم بولتے تھے۔ زیادہ وقت اکڑوں بیٹھ کر سر گھٹنوں میں دبائے رکھتے تھے۔ یہی اندازِ نشست باباتاج الدینؒ کا تھا۔ غذا بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ پھر بابا قادر نے وجیانگرم کے باہر جنگل میں ڈیرا ڈال لیا۔ یہ ایک ویران جگہ تھی جہاں لوگ دن کو بھی جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپ پر فقیری کا رنگ تیزی سے چڑھنا شروع ہوا۔ جو کہہ دیتے پورا ہو جاتا۔

پہلے پہل تو بابا قادر جنگل میں کھلی چٹان پر بیٹھا کرتے تھے لیکن بعد میں دوستوں نے پتھر میں سوراخ کر کے تاڑ پان کی ایک چھتری نصب کر دی۔ ۱۹۲۵ ءمیں چٹان پر چار کھمبوں کے اوپر گنبد نما چھت ڈال کر پتھروں کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔ ۱۹۳۱ ءسے بابا صاحب نے اس حجرے میں مستقل رہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ حجرے کے آس پاس دوسری تعمیرات نمودار ہونے لگیں۔ حجرے کے ساتھ ایک محفلِ خانہ تعمیر کر دیا گیا۔ لوگوں نے چاہا کہ محفل خانے کو پکا تعمیر کر دیا جائے لیکن بابا قادر نے اجازت نہ دی۔ محفل خانے کا فرش بھی ریت کا تھا۔

بابا قادر کی شخصیت نے اس ویران جگہ کو جہاں لوگ دن کے وقت جاتے ہوئے ڈرتے تھے، ایک بارونق جگہ میں بدل دیا۔ ایک چھوٹی سی بستی وہاں موجود میں آگئی۔ جس کا نام قادر نگر رکھا گیا۔

مشکلات اور پریشانیوں میں گرفتار لوگ قادر نگر پہنچ کر درختوں کے نیچے انتظار کرتے کہ باباقادر آئیں اور ان کی بپتا سنیں۔ باباقادر محفل خانے کے چبوترے کے کنارے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ بائیں طرف بنے ہوئے کٹہرے میں لوگ ایک ایک کر کے آتے۔ باباقادر ہر ایک کے مسئلے کو نہایت توجہ، محبت اور شفقت کے ساتھ سنتے، ڈھارس بندھاتے، اطمینان دلاتے اور جس طرح مناسب سمجھتے مدد فرماتے۔ روزانہ یہی معمول رہتا۔ اور جب تک ایک ایک شخص کی بات نہ سن لیتے اپنی جگہ سے نہ ملتے۔ دیکھنے والا مصروفیت دیکھ کر تھک جاتا لیکن باباقادر کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی۔

باباقادر کا پسندیدہ ترین عمل غریبوں اور بھوکوں کو کھانا کھلانا تھا۔ آپ کھانا کھلا کر بے حد خوش ہوتے تھے اور آپ کے چہرے پر اطمینان دوڑ جاتا تھا۔ عقیدتمند اور متمول حضرات کسی مستقل ذریعے سے پیسہ دینا چاہتے تو باباقادر کہتے۔ "جو آج کا اللہ ہے وہی کل کا بھی اللہ ہے۔ اگر تم خرچ کرنا چاہتے ہو تو غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور ان کی امداد کرو۔" جو لوگ آپ سے تعلق رکھتے تھے ان سے فرماتے۔ "رزقِ حلال کیلئے سعی اور کوشش کرو لیکن توکل کو ہاتھ سے نہ چھوڑو اور امید و بیم سے ماوراہو جاؤ۔"

۱۹۵۹ء میں باباقادر ناگپور گئے اور بابا تاج الدینؒ کے مزار پر حاضری دی۔ مزار پر یہ شعر پڑھا۔

جنت کا در کھلا ہے ترے در کے سامنے
بے شک خدا کا گھر ہے ترے گھر کے سامنے

آپ نے اس جگہ کی بھی زیارت کی جہاں بابا تاج الدینؒ بیٹھا کرتے تھے۔ اس جگہ کو بھی دیکھا جہاں بابا تاج الدینؒ رہتے تھے اور بابا تاج الدینؒ کے پلنگ اور چبوترے کو بوسہ دیا۔ ناگپور سے واپسی پر آپ نے اس بات کی طرف کئی اشارے کئے کہ ان کا وقتِ

رخصت قریب ہے۔ دن بدن آپ کی طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوتا گیا اور بالآخر ۲۷ر جنوری ۱۹۶۱ء کو آپ نے اس دنیا سے پردہ فرمالیا۔

حضرت مولانا محمد یوسف شاہ

آپ کا اصل نام مولانا عبدالکریم تھا اور علاقے جے پور سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ایک فاضل عالم تھے اور صوفی عبدالحکیم شاہ سے بیعت تھے۔ صوفی عبدالحکیم شاہ نے آپ کو حکم دیا کہ تم واکی جا کر بابا تاج الدینؒ کی خدمت میں حاضری دو۔ مولانا عبدالکریم مرشد کے حکم کے مطابق باباصاحبؒ کے پاس پہنچے تو ان کی مجذوبانہ حالت دیکھ کر مایوسی پیدا ہوئی اور خیال کیا کہ جو شخص خود نیم بے ہوش دکھائی دیتا ہے وہ میری کیا تربیت کرے گا۔ نہ جانے کیوں میرے مرشد نے مجھے ایسے شخص کے پاس بھیج دیا ہے۔ مولانا ابھی اسی الجھن اور مایوسی میں گرفتار تھے کہ بابا تاج الدینؒ نے سر اٹھا کر آنکھیں کھولیں اور لمحہ بھر کے لئے مولانا کی طرف دیکھا۔ مولانا کے ہوش و حواس جاتے رہے اور عالمانہ لباس اتار پھینکا۔

کئی دن تک مولانا عبدالکریم پر مستی و بے خودی طاری رہی۔ ایک دن باباصاحبؒ نے بلا کر حکم دیا کہ کاٹھیاوار جاؤ۔ حکم ملتے ہی مولانا کاٹھیاوار پہنچے اور وہاں رشد وہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ کاٹھیاوار سے واپس باباصاحبؒ کی خدمت میں پہنچے تو باباصاحبؒ نے اپنی نعلین (جوتیاں) دیتے ہوئے کہا۔ "لو، ان کو پھیلاؤ۔" پھر مولانا کو یوپی جانے کا اشارہ ہوا۔ یوپی میں مولانا عبدالکریم نے باباصاحبؒ کے سلسلے کو بہت وسعت دی اور بڑے بڑے علماء اور مقتدر افراد باباصاحبؒ کے حلقۂ عقیدت میں داخل

ہوئے۔ ان میں نواب چھتاری، سابق صدر اعظم حیدر آباد، دکن اور نواب سمیع خاں طالب نگری بھی شامل تھے۔

یکم ذی الحجہ ۱۳۶۶ ھ کو اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔

خواجہ علی امیر الدین

آپ کی ولادت ایک بنجارے گھر میں ہوئی۔ جائے پیدائش مقام پینگنا ضلع ناگپور تھا۔ آپ پیدائشی طور پر غیر معمولی صفات کے حامل تھے۔ چھ برس کی عمر ہو گئی لیکن نہ کسی سے بات چیت کرتے اور نہ کھانے پینے کی آپ کو کوئی پروا تھی۔ والدین پریشان ہو کر آپ کو واکی شریف میں باباتاج الدینؒ کے پاس لائے۔ باباصاحبؒ نے فرمایا۔

"ان کو مت ستایا کرو۔ یہ بڑی شان والے ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ ان کا نام خواجہ علی امیر الدین ہے۔"

اب لوگ آپ کو خواجہ علی امیر الدین کہنے لگے اور ہر شخص آپ کا احترام کرنے لگا۔ چند دنوں بعد خواجہ صاحب کے والدین تو گھر واپس چلے گئے لیکن خواجہ صاحب اور نا کے دادا باباصاحبؒ کے پاس واکی ٹھہر گئے۔ ان دنوں خواجہ صاحب کا یہ حال تھا کہ اکثر راتوں کو جنگل کی طرف نکل جاتے اور صبح واپس آتے تو ایک دو سانپ گلے میں ہار کی طرح لٹک رہے ہوتے۔ سانپ کی موجودگی سے ان کے دادا اور دوسرے لوگ ڈر جاتے۔ یہ طرزِ عمل بہت دن جاری رہا۔ لیکن سانپ نے کسی کو نہیں کاٹا۔ خواجہ صاحب کے دادا ناراض ہوتے کہ اگر کسی کو سانپ نے کاٹ لیا تو کیا ہوگا؟ یہ سن کر خواجہ صاحب سانپوں کو گلے سے اتار کر زمین پر رکھ دیتے۔ اور اشارے سے بھگا دیتے۔

جب باباتاج الدینؒ ندی کی طرف یا جنگل کے اندر گھومنے جاتے تو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے۔ خواجہ علی امیر الدین کے دادا بھی خواجہ صاحب کو کندھے پر اٹھائے

ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ مشہور ہو گیا تھا کہ خواجہ صاحب جس شخص کے کندھے پر سوار ہو جاتے ہیں اس کی دلی مراد ضرور پوری ہوتی ہے۔ چنانچہ لوگ آپ کو بخوشی اپنے کندھے پر اٹھائے گھومتے جب باباتاج الدینؒ واکی سے شکردرہ گئے تو راجہ رگھوراؤ نے خواجہ صاحب کے رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ شکردرہ میں قیام کے دوران خواجہ صاحب اکثر جلال میں رہتے تھے۔اور کبھی کبھی تو تلی زبان میں کچھ کہہ بھی دیتے۔

ایک دن خواجہ علی امیر الدین حالتِ جذب و جلال میں حضرت باباتاج الدینؒ کی خدمت میں آئے اور تو تلی زبان میں کہا۔

"محل توالت دوں؟"(محل کو الٹ دوں)

خواجہ صاحب نے دو بار یہ جملہ ادا کیا۔ باباتاج الدینؒ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس گئے اور انگشتِ شہادت سے تین بار ان کے منہ کو مارتے ہوئے کہا۔

"حضرت! یہ دعا درکار ہے۔"

یہ سن کر خواجہ صاحب سناٹے میں آگئے اور گھرا کر اپنی قیام گاہ کی طرف بھاگے۔ اس دن کے بعد آپ کا جلال جمال میں بدل گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی خواجہ صاحب پر باباصاحبؒ کا اس قدر رعب اور خوف طاری رہا کہ پوری زندگی باباصاحب کے قریب نہیں گئے۔ دور ہی سے سلام و نیاز پیش کرتے تھے۔

خواجہ علی امیر الدین کی شخصیت باباصاحب کے فیض یافتگان میں ایک منفرد مقام کی حامل سمجھی جاتی تھی۔ آپ ایک جلیل القدر ولی اللہ تھے اور بہت سی کرامتیں آپ سے منسوب ہیں۔ آپ کے وصال کا حال بمبئی والے بابا کے تذکرے میں آئے گا۔

حضرت قادر محی الدین

آپ کی عرفیت بمبئی والے بابا تھی اور بابا تاج الدینؒ آپ کو مستان بابا کہتے تھے۔ بمبئی والے بابا شکر درہ بابا تاج الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ خواجہ علی امیر الدین کے ہم صفت تھے اور توتلی زبان میں بات کرتے تھے۔ عالمِ جذب میں اپنے کپڑے پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ بابا تاج الدینؒ نے کئی بار اپنا کرتا اتار کر عطا کیا۔ آپ اس کو پہن لیتے لیکن یکایک جوش میں آکر پھاڑ دیتے۔ مستان بابا، باباصاحبؒ سے دور دور رہتے تھے۔ لیکن ان کی مجذوبانہ حالت دیکھ کر بابا تاج الدینؒ کے حضور ان کو لے جایا گیا۔ باباصاحبؒ آرام فرمارہے تھے۔ اٹھ بیٹھے اور کہا۔

"حضرت دھوپ میں نہیں رہتے ، ہم بھی چھاؤں میں رہتے ہیں ، تم بھی چھاؤں میں رہا کرو۔" یہ کہہ کر باباصاحب نے اپنا جبہ ان کو عطا کرتے ہوئے کہا۔ "جبہ پہنا کرو۔" اس دن سے آپ نے جبہ پھاڑا نہیں۔

ایک دفعہ حضرت قادر محی الدین باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باباصاحبؒ نے انہیں آتے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

"دیکھو حضرت! یہ مست آرہے ہیں۔ تم لوگوں نے سر مست کا نام سنا ہے نا۔ ان کا نام قادر محی الدین ہے۔ یہ مست ہیں۔ ان سے ڈرا کرو کہ ہم ڈرتے ہیں۔ یہ کالے ناگ ہیں۔ دیکھو ان کے سر کو۔"

لوگوں نے دیکھا کہ ان کے سر کے بال صاف کئے جاتے تو ایک سانپ جیسا نشان نظر آتا جس میں سانپ کا پھن پیشانی کی طرف ہوتا۔ آپ کی پیشانی پر چاند کا نشان تھا جس میں سانپ کا پھن رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آپ اس قدر پرکشش اور وجیہ تھے کہ لوگ آپ کو دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔

آخری زمانے میں مستان باباصاحب پر ہمہ وقت استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ جب کبھی ہوش میں آتے تو اشاروں سے اس بات کو ظاہر کرتے کہ ان کا آخری وقت قریب ہے۔ وصال سے چھ ماہ پہلے سے جو قوال آپ کے پاس آتا، آپ اس سے کہتے۔ "گاؤ، سیاں گیو بڑی لمبی سفر۔" کبھی خوش ہو کر آپ بھی گانے لگتے۔ وصال سے چند دن پہلے جسم پر کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر معائنہ کرتا لیکن کوئی مرض سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد آنکھیں کھول کر کہتے۔ "لاؤ میری دوا۔" وصال سے ایک روز پہلے کہا۔ "ہم کو نہلاؤ، اور دولہا بناؤ۔" چنانچہ آپ کو غسل دے کر نئے کپڑے پہنا دیئے گئے۔ پھر آپ نے رسی طلب کی اور ایک سرا حضرت فریدالدین کو دیتے ہوئے کہا۔ "دور جا۔" جہاں تک رسی جا سکتی تھی لے جائی گئی۔ مستان بابا نے کہا۔ "ڈیٹھ (دیکھ)! یہ میری درگاہ ہے۔" وصال کے دن بار بار کہتے۔ "چار بج گیا، ہماری دوالاؤ۔"

آپ کی یہ حالت دیکھ کر لوگ ملاقات اور سلام کے لئے حاضر ہونے لگے۔ آپ ہر ایک کو دعا دیتے اور کہتے۔ "چار بجے آؤ۔" جمعہ کا دن تھا۔ جیسے جیسے چار بجے کا وقت قریب آرہا تھا۔ آپ کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ بار بار کہتے "ہماری دوالاؤ، ہماری دوالاؤ۔" بے تابی دیکھ کر شربت بنا کر پیش کیا گیا۔ آپ اللہ اکبر کہہ کر اٹھ بیٹھے اور کپڑے بدل کر صرف ایک کمبل آدھے جسم پر لپیٹ لیا۔ شربت کا گلاس لے کر

اللہ اکبر کہااور پی لیا۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر لیٹ گئے اور اللہ اکبر کے ساتھ ہی روح نے جسم کو چھوڑ دیا۔ تاریخِ وصال ۴؍ صفر المظفر ۱۳۰۰ھ تھی۔

جس دن مستان باباصاحب سے رخصت ہونے والے تھے، صبح حضرت خواجہ علی امیر الدین مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ آدھ گھنٹے تک دونوں میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔ اٹھتے وقت خواجہ صاحب نے بآوازِ بلند مستان باباسے کہا کہ آج آپ تشریف لے جا رہے ہیں اور میں آپ کے ایک دن بعد آجاؤں گا۔ ایک سال بعد ۲۶؍ ربیع الثانی کی صبح سے خواجہ صاحب نے بار بار یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم باباصاحبؒ (باباتاج الدین) کی چھبیسویں کی فاتحہ میں جارہے ہیں۔ اب واپس نہ آئیں گے۔ جو بھی آپ سے ملنے آتا، آپ یہی کہتے۔ شام کو جب آپ کو تاج آباد لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ یکایک پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ لوگ دوڑ کر کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ پلنگ پر سجدہ کی حالت میں پڑے ہیں اور روح پرواز کر چکی ہے۔

مہاراجہ رگھوجی راؤ

حکمراں مرہٹہ خاندان کے چشم وچراغ تھے۔آپ مہارراجہ جانوجی راؤ کے ولی عہد تھے جن کی حکومت شرقاً غرباً وردھاندی سے مہاندی بنگال تک اور شمالاً جنوباً گوداوری ندی کے قرب وجوار سے نربداندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ مہاراجہ جانوجی راؤ کو حکومت برطانیہ سے پولیٹکل پنشن کے علاوہ بہت سے گاؤں بھی اس خاندان کی ملکیت تھے۔

راجہ رگھوجی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آپ باباتاج الدینؒ کو پاگل خانے سے ضمانت پر رہا کرا کے اپنے محل لے گئے۔اس کا حال ابتداء میں درج کیا جاچکا ہے۔ شکردرہ محل میں راجہ رگھوجی نے باباصاحبؒ کو ہر طرح کا آرام وآسائش بہم پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی راجہ صاحب نے جس طرح باباصاحبؒ کی خدمت کی وہ ایک مثال ہے۔ انہوں نے اپنا محل،اپنے خدّام،اپناسب کچھ باباصاحبؒ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

راجہ صاحب باباجی کو ایک دیوتا کا درجہ دیتے تھے اور ان کے سامنے کوئی عرض پیش کرتے تو اس طرح جیسے ایک دیوتا کے آگے پیش کرتے ہیں۔ایک دفعہ باباصاحب بےراجہ کے مندر کا بت توڑ ڈالا۔پجاریوں نے شور مچادیا۔راجہ صاحب سے شکایت کی گئی تو انہوں نے مسکرا کر صرف اتنا کہا۔" باباصاحب بھی دیوتا ہیں ۔ یہ معاملہ دیوتاؤں کا ہے۔آپس میں خود نمٹ لیں گے۔ہمارا تمہارا بولنا بےادبی ہے۔"

خود باباتاج الدینؒ کو راجہ صاحب سے جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ راجہ صاحب کو اپنا "بڑا بھائی" کہہ کر پکارتے تھے۔ پاگل خانے سے نکلنے کے بعد باباصاحبؒ کچھ دن شکر درہ میں راجہ صاحب کے پاس رہے۔ پھر واکی تشریف لے گئے۔ واکی میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد باباصاحب دوبارہ شکر درہ چلے گئے۔ یہ شاید راجہ صاحب کا خلوص اور ان کی محبت تھی جن کی پذیرائی میں باباصاحب نے دوبارہ شکر درہ کو اپنا مسکن بنایا۔

باباصاحب کی ذات استغنا کی مکمل تصویر تھی۔ باباصاحب ہر علائق سے آزاد سر برہنہ اور پابرہنہ گھومتے اور لوگوں کی دادرسی فرماتے۔ اگرچہ بڑے امراء اور رؤسا آپ کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور چاہتے کہ باباصاحب ان کی نذر یا خدمت کو قبول کر لیں۔ لیکن باباصاحب نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ایک بار نظامِ دکن نے کچھ زمین بابا صاحب کو نذر کرنی چاہی تو آپ نے ملکیت کے کاغذات پھاڑ ڈالے۔ باباصاحب کے اس طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باباصاحب نے مہاراجہ رگھوجی کی خدمت قبول کی تو اس سے راجہ صاحب کی شخصیت کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ آخری زمانے میں جب کچھ لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ باباصاحب شکر درہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں تو راجہ صاحب یہ سن کر آزردہ خاطر ہو گئے۔ لیکن باباصاحبؒ نے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا:

"تیرے گھر سے میرا بستر لاکھوں برس نہیں اٹھ سکتا۔"

شکر درہ محل میں باباصاحب کا رہائشی کمرہ، پلنگ اور دیگر جگہیں ایک یادگار کی طرح محفوظ ہیں اور زائرین لازماً شکر درہ محل میں حاضری دیتے ہیں جو باباصاحب کی چلہ گاہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔

حضرت فتح محمد شاہ

جب باباتاج الدین اولیاءؒ پاگل خانے سے شکردرہ راجہ رگھو جی راؤ کے پاس جانے لگے تو فرمایا۔ "یہ جگہ خالی نہ رہے گی۔" باباصاحبؒ کا یہ فرمان حضرت فتح محمد شاہ صاحب کے ذریعے پورا ہوا۔

فتح محمد شاہ صاحب افغانستان سے آکر ضلع واردھا کے ایوت محل میں مقیم تھے اور وہاں ایک مسجد میں جاکر عبادت وریاضت کیا کرتے تھے۔ ابھی یہ معمول جاری تھا کہ ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ جذب کی کیفیت سے پہلے بھی بابا صاحب کی خدمت میں پاگل خانے آتے تھے اور باباصاحب کے حکم سے واردھا تشریف لے گئے تھے۔ جب حضرت فتح محمد شاہ صاحب پر جذب کی کیفیت روزافزوں ہونے لگی تو لوگوں نے آپ کو پاگل سمجھ کر ناگپور کے پاگل خانے میں داخل کرادیا۔ جس دن آپ کو پاگل خانے میں داخل کیا گیا اسی دن باباتاج الدینؒ پاگل خانے سے شکردرہ تشریف لے گئے۔

ابھی حضرت فتح محمد شاہ صاحب کو پاگل خانے میں وارد ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ آپ کی شہرت ایک پہنچے ہوئے شخص کی حیثیت سے ہونے لگی۔ باباتاج الدینؒ کے وصال کے بعد مہاراجہ رگھو جی پاگل خانے گئے تاکہ حضرت فتح محمد شاہ صاحب کو ضمانت پر رہا کراکر شکردرہ لائیں۔ جب راجہ صاحب نے فتح محمد شاہ صاحب سے یہ بات کہی تو انہوں

نے جواب دیا۔" وہ جگہ تو سر کے بل چلنے کی ہے اور تو مجھے آج ہی وہاں لے جانا چاہتا ہے۔" چنانچہ آپ عمر بھر پاگل خانے میں رہے۔ وصال کے بعد آپ کا جنازہ تاج آباد لایا گیا تو آپ کی یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ جگہ تو سر کے بل چلنے کی ہے تو مجھے "آج ہی" وہاں لے جانا چاہتا ہے یعنی جیتے جی میں اس جگہ جانے کے قابل نہیں ہوں۔

حضرت کملی والے شاہ

باباتاج الدینؒ نے آپ کو گوڈر شاہ کا خطاب دیا تھا۔ عالم، فاضل اور عبادت گزار تھے۔ جب باباصاحبؒ کی خدمت میں شکردرہ آئے تو ایک جھونپڑے میں عزلت نشینی اختیار کرلی۔ کسی کو جھونپڑے کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ لوگ آپ کی غذا جو دال کا پانی ہوتی تھی اور چائے اندر سرکا دیتے تھے۔ ایک دن باباتاج الدینؒ ان کے جھونپڑے کے پاس سے گزرے اور کہا۔"دروازہ کھول دو۔"

جب دروازہ کھول دیا گیا تو کملی والے شاہ صاحب نے سماع کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ ایک غزل شروع کی گئی اور آپ خوش و خرم اور مسرور بیٹھے سنتے رہے۔ دورانِ غزل یہ مصرعہ آیا۔

اِدھر خیال چلا اور اُدھر چلی لیلیٰ

یہ سنتے ہی آپ نے ایک نعرہ بلند کیا اور لیٹ گئے۔ جب تیسری بار یہ مصرعہ پڑھا گیا تو آپ کی روح پرواز کر گئی۔ شکر درہ کے تالاب کے کنارے دفن کئے گئے۔

حضرت رسول بابا

باباتاج الدینؒ کی خدمت میں ایک صاحب اکثر حاضر ہوتے جو ذات کے کومٹی (بنیا) تھے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے اکثر دعا کی درخواست کرتے۔ کئی دفعہ عرض کرنے کے بعد باباصاحب نے فرمایا۔ "پہلا بچہ ہمارا ہوگا۔ جا لے آ!"

نوماہ بعد وہ صاحب ایک لڑکے کے باپ بن گئے۔ حسبِ وعدہ انہوں نے نوزائیدہ کو باباصاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ باباصاحبؒ نے بچے کا نام "رسول" رکھا اور پرورش کے لئے اپنے ماموں عبدالرحمٰن صاحب کے حوالے کر دیا۔

رسول بابا پیدائشی مجذوب صفت تھے۔ باباصاحبؒ کے پاس آتے تو آپ کے گرد پروانے کی طرح چکّر کاٹتے۔ اکثر آپ مستانہ انداز میں " یاتراب! یاتراب" کا نعرہ لگاتے۔

باباتاج الدینؒ کے دربار سے آپ کو یہ خدمت سپرد ہوئی تھی کہ جو بھی آسیب زدہ دربارِ تاج اولیاء میں آتا اور جہاں بھی ٹھہرتا، آپ اسی وقت وہاں پہنچ جاتے اور اس کو ٹھیک کر دیتے۔ باباتاج الدینؒ کے وصال کے بعد آپ کا وصال ۱۸ ر سال کی عمر میں ہوا اور باباصاحبؒ کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔

حضرت مسکین شاہ

آپ کا اصل نام غلام مصطفی تھا اور آپ شطاریہ اور قادریہ سلسلے سے نسبت رکھتے تھے۔ آپ کے مرشد نے بابا تاج الدینؒ کو بارگاہ میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ بابا تاج الدینؒ کے حکم کے مطابق آپ ناگپور پولیس لائن ناکلی کی مسجد میں پیش امام ہو گئے اور باباصاحبؒ کی نسبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ حضرت مسکین شاہ کی طبیعت میں عجز وانکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد باباصاحبؒ نے ان کو سکندر آباد، بلند شہر روانہ کر دیا۔ اور آپ نے وہاں رشد وہدایت اور خدمتِ خلق کا مشن جاری کیا۔

حضرت اللہ کریم

شکر درہ کے رہنے والے دیکھتے تھے کہ شکر درہ کے صدر دروازے پر ایک شخص ٹن کا ڈبہ اور ایک رکابی ہاتھوں میں لئے کھڑا رہتا ہے اور وقفے وقفے سے صدا لگاتا ہے:

"اللہ کریم آیا ہے، باسی کھانا لایا ہے۔"

جب کوئی کھانا پیش کرتا تو وہ شخص رکابی میں کھانا اور ٹن کے ڈبے میں پانی لے لیتا۔ یہ لوگ انہیں اللہ کریم کہتے تھے۔ حضرت اللہ کریم کو کمبل یا کوئی کپڑا انذر کیا جاتا تو آپ بازار لے جاکر اسے فروخت کر دیتے اور جو پیسے ملتے انہیں محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔

لوگ یہ بھی دیکھتے کہ صدر دروازے پر دربان کی طرح کھڑے ہوئے اللہ کریم کبھی کبھی یکایک مؤدب ایستادہ ہو جاتے اور بآوازِ بلند پکارتے:

"خبر دار ہو جاؤ، کالا بنگلہ آتا ہے۔"

دس پندرہ منٹ بعد شکر درہ کے محل سے حضور باباتاج الدینؒ باہر آتے۔ گویا آپ پہلے سے لوگوں کو باباصاحبؒ کے آنے کی اطلاع کر دیتے تھے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں ۔اسی طرح جب باباصاحبؒ کی سواری سامنے سے گزرتی تو حضرت اللہ کریم فوجی انداز سے سیلوٹ کرتے اور جب باباصاحبؒ واپس نہیں آتے، دروازے پر اس طرح موجود رہتے جیسے نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے ہوں۔

حضرت اللہ کریم کا وصال باباصاحب کے پردہ فرمانے کے چند دن بعد ہوا اور تاج آباد کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

حضرت باباعبدالرحمٰن

آپ مدراسی پلٹن میں ملازم تھے۔ وہاں سے وظیفہ ملتا تھا۔ بعد میں آپ نے کسی بحری جہاز پر نوکری کرلی۔ ایک بار سفر کرتے ہوئے جہاز پر سے پانی میں گر گئے۔

باباتاج الدینؒ سے عقیدت اور محبت کی وجہ سے آپ نے باباصاحبؒ کا تصور کیا تو نامعلوم طریقے سے کنارے تک پہنچ گئے۔ وہاں سے پیدل ہی باباتاج الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

باباتاج الدینؒ کی توجہ سے آپ پر جذب طاری ہو گیا۔ باباصاحبؒ نے آپ کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ اور اسی نام سے آپ مشہور ہوئے۔ جب آپ پر استغراق کا غلبہ ہوا تو کپڑوں سے بے نیاز ہو کر ایک قبرستان میں رہنے لگے۔ ایک دن جب آپ نے بے خودی کی حالت میں باباصاحبؒ کے پاس پہنچے تو باباصاحبؒ نے ایک کپڑا عطا کر کے احرام باندھنے کا حکم دیا۔ احرام باندھتے ہی جذب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ باباتاج الدینؒ کے آپ کو گاڑھا گھاٹ کامٹی جا کر ہریجنوں کے مندر میں رہنے کا حکم دیا۔

باباعبدالرحمٰن کامٹی کے مندر میں رہ کر راہِ حق کے متلاشیوں کو راستہ دکھانے لگے اور پریشان حالوں کی دادرسی آپ کے ذریعے ہونے لگی۔ مندر کا انتظام وانصرام ایک ہریجن خاتون کرتی تھی۔ وہ بھی باباعبدالرحمٰن کے ہاتھوں پر بیعت ہو گئی۔

ابھی خدمت کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ باباعبدالرحمٰن کی طبیعت خراب ہو گئی۔ آپ باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باباصاحبؒ نے کہا۔ "آپ پہلے جائیں میں بھی آرہا ہوں۔"

چنانچہ باباتاج الدینؒ کے وصال سے تین دن پہلے، ۲۳، محرم الحرام ۱۳۴۴ ھ کو باباعبدالرحمٰن اس دنیا سے پردہ کر گئے۔ آپ کی تدفین سر گروہ کی تکیے میں کی گئی۔

حضرت باباعبدالکریم

آپ کے والدین احمد صاحب ضلع مچھلی بندر کے انعام دار تھے۔ آپ کے پانچ بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ آپ ملٹن نمبر ۶۳ء میں ملازم ہوگئے اور آپ کی تعیناتی ناگپور ہوئی۔ آپ جمناسٹک میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

کسی وجہ سے آپ نے اپنے والد کو خط میں سخت الفاظ لکھ دیئے جس سے آپ کے والد حسن احمد صاحب ان سے ناراض ہوگئے۔اِدھر باباعبدالکریم نے ملازمت چھوڑ دی۔اور کامٹی ندی کے کنارے ایک بزرگ کے مزار پر معتکف ہوگئے۔ان بزرگ نے عالمِ بشارت میں ان سے کہا کہ اس زمانے میں باباتاج الدینؒ عارفین کے سردار ہیں، تم ان کی خدمت میں جاؤ۔

باباعبدالکریم دربار تاج الاولیاء میں حاضر ہوئے۔ باباصاحب نے دیکھتے ہی فرمایا۔"تم اپنے والد کی زیارت کرکے آؤ۔"

حکم کے مطابق والد کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ باباصاحبؒ کی خدمت میں صرف چند ثانیوں کی حاضری نے آپ کے اندر عجیب تبدیلی پیدا کردی تھی۔آپ زیادہ تر خاموش رہتے اور اکثر کھانا کھانا بھی بھول جاتے۔نرمول پہنچ کر باباعبدالکریم اپنے والد سے ملے اور وہاں سے واپس باباصاحبؒ کی خدمت میں واپس آگئے۔

باباتاج الدینؒ نے باباعبدالکریم کا نام محمد حسین رکھا۔

ایک دفعہ ناگپور میں طاعون کی وبا بہت شدت سے پھیلی۔ ہزاروں افراد موت کا لقمہ بننے لگے۔ بابا تاج الدینؒ نے محمد حسین بابا کو بلا کر کہا۔ "اونٹ پر بیٹھ کر ناگپور کی گلی گلی گھومو اور بلا کو بھگاؤ۔"

محمد حسین بابا اونٹ پر بیٹھ کر گلی گلی گھومنے لگے۔ لوگ کسی مریض کو آپ کے پاس لاتے تو آپ بابا صاحبؒ کا نام لے کر لعابِ دہن طاعون کی جگہ پر لگا دیتے اور مریض موت کے منہ سے نکل آتا۔ کچھ دنوں میں ناگپور سے طاعون کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد طاعون نے شہر کو اپنا نشانہ نہیں بنایا۔

محمد حسین بابا کا وصال ۱۹۴۱ ءمیں ہوا۔ آپ کا مزار شکر درہ کے باہر تاج آباد میں ہے جہاں آج بھی بابا تاج الدینؒ کا عرس منایا جاتا ہے۔

حضرت حکیم نعیم الدین

آپ کا تعلق مدراس سے تھا اور اجداد فوجی تھے۔ حکیم صاحب کے چچا حیدر آباد دکن کے شاہی طبیب تھے۔ چچا نے بے اولاد ہونے کی وجہ سے ان کو لے کر پالا تھا۔ چچا نے آپ کو اچھی تعلیم دلوائی اور طب بھی پڑھائی۔ بابا تاج الدینؒ کا ذکر سنا تو شوقِ دیدار میں واکی حاضر ہوئے۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا۔" دنیا کا چند روزہ تماشہ دیکھ کر آؤ۔" حکیم صاحب حیدر آباد واپس چلے گئے۔

کلیانی کے نواب حکیم صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اپنا معتمد بنالیا۔ اعتماد یہاں تک بڑھا کہ حکیم صاحب نواب صاحب کی جائداد کے مختار ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حکیم نعیم الدین کو بہت صدمہ ہوا اور باباتاج الدینؒ کے الفاظ یاد آئے کہ دنیا کا چند روزہ تماشہ دیکھ کر آؤ۔

حکیم نعیم الدین کلیانی سے حیدر آباد دکن چلے آئے اور ارادہ کیا کہ باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوں لیکن والدہ بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں تو اپنی جائداد اور سرمایہ رشتہ داروں اور غریبوں میں تقسیم کر کے فقیرانہ لباس میں دربار تاج الاولیاءؒ روانہ ہوئے۔ چلتے ہوئے آپ نے جھولے میں چچا کی مجرب ادویات بھی رکھ لیں۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا بھی شریکِ سفر ہو لیا۔

شکر درہ پہنچ کر آم کے درختوں کے نیچے قیام کیا۔ شریکِ سفر بوڑھے کے پاس جو روپیہ پیسہ تھا وہ راستے کے اخراجات میں ختم ہو گیا۔ دوسرے روز بھوک نے ستایا تو حکیم صاحب مٹی کا ایک ٹھیکرا لے کر قریبی لنگر پر گئے۔ لنگر تقسیم کرنے والا لوگوں سے درشتی سے پیش آرہا تھا۔ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور خالی ہاتھ واپس چلے آئے۔ وہ دن بھوکے رہ کر گزارا۔ اگلے دن ہمراہی بوڑھے نے بھوک کی شکایت کی۔ حکیم صاحبؒ کے پاس کسی فقیر کی دی ہوئی اکسیر تھی اس سے ایک تولہ سونا تیار کیا اور بوڑھے کو دیا کہ بازار میں فروخت کر آؤ۔ ادھر بوڑھا بازار گیا، باباتاج الدینؒ اپنی قیام گاہ سے نکل کر درخت کے نیچے آئے اور حکیم صاحب سے کہا۔ "عقبیٰ کا متلاشی دنیا لے کر آیا ہے۔" یہ کہہ کر اکسیر بنانے کے سامان کو اوندھا کر دیا اور چلے گئے۔

کچھ دیر بعد بوڑھا بازار سے کھانے کا سامان لے کر آ گیا۔ حکیم صاحب نے باباصاحبؒ کی آمد کا حال کہہ کر بوڑھے کو واپس حیدر آباد بھیج دیا اور وہ جھولا جس میں اکسیر وغیرہ رکھا ہوا تھا زمین میں دفن کر دیا۔ دو دن حکیم صاحب نے درخت کی پتیاں کھا کر گزارے۔ تیسرے روز وزیر نامی صاحب جو بعد میں وزیر باباجھنڈے والے کی نام

سے مشہور ہوئے وہاں آئے اور حکیم صاحب کو اپنی جھونپڑی میں لے گئے۔اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنے لگے۔

رفتہ رفتہ لوگوں میں حکیم نعیم الدین صاحب کی شہرت ہونے لگی اور لوگ آپ کی عزت کرنے لگے۔آپ کے لئے جھونپڑی بھی بنادی گئی جس میں آپ معتکف رہتے۔بہت کم باہر نکلتے تھے۔آپ کو باباتاج الدینؒ سے ایسی ذہنی نسبت ہوگئی تھی کہ جب لوگوں کو باباصاحبؒ کی کہی ہوئی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تو آپ سے رجوع کرتے۔آپ فوراًاُس کا مطلب بتادیتے تھے۔

وصال کے دن آپ نے کہہ دیا تھا کہ آج ہماری روانگی ہے۔آپ کا حال یہ تھا کہ گھنٹے،آدھا گھنٹے بعد آنکھیں کھول کر پوچھتے،"کتنا بجا ہے؟"شام کو پانچ بجے کے قریب پھر یہی سوال کیا تو بتایا گیا کہ پانچ بجے ہیں۔یہ سن کر حکیم صاحب نے بلند آواز سے کہا۔

"لااِلٰہ اِلّااللہ،پیر نبی جی صلی اللہ۔"تیسری دفعہ یہ کہنے کے ساتھ ہی آپ کی روح پرواز کرگئی۔حکیم نعیم الدین صاحب کا مزار نندورا میں گیان ندی کے کنارے واقع ہے۔

حضرت محمد عبدالعزیز عرف نانامیاں

حضرت محمد عبدالعزیز مدراسی تھے اور آپ کے والد کا تعلق فوج سے تھا۔ان کی سرگزشت جو خود انہوں نے بیان کی،یوں ہے:

میں رائے پور میں سکونت پذیر تھا۔ یہاں اکثر مشائخ آتے اور کوشش کرتے کہ میں ان کا مرید ہو جاؤں لیکن میں انکار کر دیتا۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ جلوہ افروز ہیں۔ ان کے ایک طرف پانی بہ رہا ہے اور دوسری طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور بزرگ کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔" یہ ہے تمہارا راستہ!"

میں بیدار ہوا تو دل سکون واطمینان سے سرشار تھا۔ اس دن کے بعد میں اکثر اس خیال میں رہتا کہ جن صاحب کی میں نے خواب میں زیارت کی ہے، ان سے نہ جانے کب ملاقات ہو۔ اس زمانے میں میرے چند دوست ناگپور کے پاگل خانے میں باباتاج الدینؒ کے پاس گئے اور ان کے اندر ہونے والی تبدیلی کو میں نے بخوبی محسوس کیا۔ نیز اور بہت سے لوگوں سے باباصاحب کی شخصیت اور کرامات کا تذکرہ سن کر میرے دل میں بھی زیارت کا اشتیاق ہوا۔

واکی میں باباصاحبؒ کے پاس حاضر ہوا تو دیکھا کہ باباصاحبؒ نے ایک تنکا اٹھایا۔ اور اپنی ران پر آہستہ آہستہ لکھنا شروع کیا۔ میں آپ کے ہاتھ کی حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ باباصاحبؒ نے اپنی ران پر میرا پورا نام مع ولدیت کے لکھ دیا۔ جب کہ میں پہلی دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور آپ سے بات تک نہیں کی تھی۔ اسی وقت مجھے اپنا خواب یاد آ گیا اور میں نے پہنچان لیا کہ میں نے خواب میں جن بزرگ کی زیارت کی تھی وہ باباتاج الدینؒ ہی تھے۔

میں اکثر باباتاج الدینؒ کی خدمت میں میلاد شریف پڑھتا تھا۔ ایک دن باباصاحبؒ نے کہا۔" کتاب لا" میں کتاب لے کر باباصاحبؒ کے پاس پہنچا تو انہوں نے ایک صفحہ کھول کر بطور نشانی لکڑی کی سیک اس پر رکھ دی اور فرمایا۔" یہ تمہارا ترک

ہے۔" یہ الفاظ سنتے ہی میرے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ مجھے دنیا اور دنیا کے معاملات ہیچ دکھائی دینے لگے۔ میرے ذہن میں ترکِ دنیا کا خیال آیا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ سب کچھ چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جاؤں گا۔ یہ خیالات ہر وقت میرے ذہن میں گشت کرنے لگے۔ چند دن بعد باباتاج الدینؒ نے دوبارہ کتاب طلب کی اور اس پر تحریر فرمایا۔" چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر۔" اور کتاب مجھے دیتے ہوئے فرمایا۔" ترک کو سمجھو۔"

اگلے روز بابا صاحبؒ نے اپنے روحانی تصرف سے مجھے سمجھایا کہ ترک کیا ہے اور میں سمجھ گیا کہ ترک، دنیا کو چھوڑ دینے کا نام نہیں بلکہ ان خیالات سے نجات حاصل کرنے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ فوراً ہی میرے دل سے دنیا چھوڑنے کا خیال ختم ہو گیا اور میں باباصاحب کی اجازت سے اپنے وطن رائے پور چلا گیا۔

رائے پور میں میری تنخواہ میں بتدریج اضافہ ہونا شروع ہوا اور یہ اضافہ اسی شرح سے ہوا جو باباصاحبؒ نے میری کتاب پر تحریر کیا تھا۔ ۲۵؍ روپئے سے بڑھ کر میری تنخواہ چالیس روپئے ہوئی۔ پھر پچاس، پھر ساٹھ، پھر ستر روپئے ہو گئی۔ رائے پور میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد میں اپنی اہلیہ کے ساتھ واکی گیا۔ وہاں دستور تھا کہ ہر شخص کھانا پکا کر باباصاحبؒ کی رہائش گاہ کی جانب گیا۔ پتہ چلا کہ باباصاحبؒ ندی کی طرف گئے ہیں۔ میں ندی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ باباصاحبؒ چاروں طرف پردہ تان کر اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ہر شخص کا لایا ہوا کھانا پیش کیا جا رہا ہے۔ میرا توشہ دان بھی پیش کیا گیا۔ لیکن باباصاحبؒ نے کسی بھی توشہ دان کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ قریب ہی ایک ہندو کسان کھانا پکا رہا تھا۔ اس نے ایک تھالی میں زرد رنگ کی نہ جانے کوئی چیز نکالی اور ساتھ میں گوار کی پھلیاں نکال کر باباصاحبؒ کی خدمت میں پیش کیں باباصاحبؒ نے تھالی لے کر یہ کھانا

نہایت خوشی اور رغبت سے کھانا شروع کیا۔ پھر پردے کو سرکار کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "آؤ کہ کھانا کھالو۔ تمہارے کام کی چیز ہے۔" میں نے دوڑ کر تھالی ہاتھ میں لے لی۔ دیکھا کہ کھانے کے ساتھ بہت سی چیزیں شامل ہیں؟ موز کے چھلکے، بیڑی کے ٹکڑے اور کچھ کنکر، پتھر۔ میں یہ کھانا بہت شوق سے کھانے لگا۔ تبرکاً بہت سے لوگ میرے ساتھ شریک ہوگئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دیکھنے میں وہ بیڑی کے ٹکڑے اور کنکر پتھر دکھائی دیتے تھے لیکن منہ میں جانے کے بعد وہ کوئی اور چیز ثابت ہوتے تھے۔ جن کا ذائقہ ناقابل بیان ہے۔

ایک دفعہ مئی کے سخت گرم مہینے میں باباتاج الدینؒ جنگل میں بہت دور تک چلے گئے۔ ساتھ جانے والے ایک صاحب چھتری باباصاحب کے سر پر پھیلائے چل رہے تھے تاکہ آپ کو دھوپ کی تکلیف نہ ہو۔ مجھ سے یعقوب نامی خادم نے کہا۔ "آپ بھی چھتری پکڑ کر خدمت میں شریک ہو جائیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے چھتری ہاتھ میں لے لی۔ اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے باباصاحب کو دیکھا تو آپ پر استغراق کی کیفیت طاری تھی اور اس درجہ خود فراموشی کے باوجود آپ اس طرح تیز تیز چلے جا رہے تھے جیسے پوری طرح باہوش ہوں۔ آپ کانٹوں، پتھروں سے بے پرواہوں چل رہے تھے جیسے وہ آپ کے راستے میں نہ ہوں۔ میں قدموں پر نگاہ کی تو ایسا لگا جیسے باباصاحب زمین سے کچھ اوپر فضا میں معلق چلے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے راستے میں ایک پتھر آیا جو زمین میں گڑا ہوا تھا۔ وہاں باباصاحب رک گئے۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "ایسے رہتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔"

ایک دفعہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان دنوں میں دنیاوی مسائل کا شکار تھا اور میرا ذہن ہر وقت ان ہی مسائل میں الجھا رہتا تھا۔ یکایک باباصاحب نمودار

ہوئے اور میرے پاس آکر کہا۔ "حضرت! پنجرے سے کبوتروں کو اڑادو۔" یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔ جیسے ہی آپ واپس ہوئے میرے ذہن میں ایک کوندے کی طرح ان الفاظ کے معانی آگئے۔ باباصاحب نے میرے دل کو پنجرہ کہا تھا اور خیالات کو کبوتروں کے ہم معنی قرار دیا تھا۔ جو ہر وقت میرے دل میں گشت کرتے رہتے تھے۔ پنجرے سے کبوتر اڑادینے کا مطلب یہ تھا کہ میں ان سے ذہن ہٹاکر یکسو ہو جاؤں کیوں کہ یکسوئی ہر معاملے میں کامیابی کی کلید ہے۔

اب میں باباصاحب کے اشارے کے مطابق ستر روپئے ماہوار پر ملازم ہو چکا تھا۔ میرے رشتے داروں نے مجبور کیا کہ تم اگلا امتحان پاس کر لو تو تمہاری تنخواہ چار سو روپئے کے قریب ہو جائے گی۔ میں ۱۹۲۲ ءمیں ناگپور آیا تا کہ امتحان دے سکوں۔ شکر درہ میں حضور باباصاحب کے پاس حاضر ہوا تو بابا نے فرمایا۔ "صوبے دار کی لال کتاب پڑھتے ہیں، گھر جاتے ہیں۔" میں بہت خوش ہوا کہ باباصاحب نے امتحان میں کامیابی کی خوش خبری دے دی ہے۔ اگلے ہی روز میں پیچش میں مبتلا ہو گیا اور اس شدت کی تکلیف ہوئی کہ میں امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ میں ناگپور سے جوں ہی رائے پور واپس پہنچا، میری تکلیف فوراً ختم ہو گئی۔ ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ وہاں کے ایک بزرگ حضرت عبدالطیف نے مجھ سے کہا۔ "عبدالعزیز! تم نے قرآن شریف نہیں پڑھا ہے، پڑھ لو اور نماز پڑھا کرو۔" میں اب تک ایک لاپرواہ قسم کا شخص تھا اور مجھے نماز تک نہیں آتی تھی۔ عبدالطیف صاحب کے ساتھ مسجد گیا اور لوگوں کی نقل کرتے ہوئے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد عبدالطیف صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اور قرآنِ پاک کھول کر میرے سامنے رکھا اور حکم دیا۔ "مجھے خود حیرت ہوئی کہ میں جس لفظ پر نظر ڈالتا وہ از خود میرے ذہن میں آجاتا اور میں پڑھ دیتا۔ "پڑھو۔" مجھے خود حیرت ہوئی کہ میں جس لفظ پر نظر

ڈالتاوہ از خود میرے ذہن میں آجاتا اور میں پڑھ دیتا۔ یہاں تک کہ میں بارہ صفحے تک تلاوت کر گیا۔ عبدالطیف صاحب نے مجھ سے کہا کہ عبدالعزیز، تم نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی، تمہیں تو قرآنِ مجید کی تلاوت بحسن وخوبی آتی ہے۔ تب میں نے عبدالطیف صاحب کو وہ پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح باباتاج الدینؒ نے مجھ سے کہا تھا کہ صوبے دار کی لال کتاب پڑھا کرو۔ یہ سن کر عبدالطیف صاحب پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی اور فرمایا کہ یہ حضور باباصاحبؒ کا تصرف ہے کہ تم لمحہ بھر میں قرآن پاک پڑھنے پر قادر ہو گئے ہو حالانکہ تم نے آج سے پہلے کبھی قرآن پاک کھول کر بھی نہیں دیکھا ہے۔

باباتاج الدینؒ کا حضرت عبدالعزیز صاحب پر قادر ہو گئے ہو حالانکہ تم نے آج سے پہلے کبھی قرآن پاک کھول کر بھی نہیں دیکھا ہے۔

باباتاج الدینؒ کا حضرت عبدالعزیز صاحب پر یہ تصرف مستقبل میں بھی جاری رہا اس طرح کہ آپ کند ذہن لوگوں کو بھی پندرہ دن کے اندر قرآن ختم کرا دیتے تھے۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے اور دس پندرہ دن میں قرآنِ پاک ختم کر کے چلے جاتے۔

نیتا آنند بابا نیل کنٹھ راؤ

آپ مرہٹہ قوم کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ مدراس کے رہنے والے اور جبل پور کے کسی آفس میں کلرک تھے۔ باباتاج الدینؒ سے گہری عقیدت تھی۔ باباصاحب سے دلی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ باباصاحبؒ کا فوٹو پاس رکھتے تھے اور اس کی

پوجا کرتے تھے۔ایک دن فوٹو سامنے رکھے ہوئے ہدیۂ عقیدت پیش کر رہے تھے کہ منظر بدل گیا۔ دیکھا کہ نہ فوٹو سامنے ہے اور نہ آپ اپنے مکان میں موجود ہیں بلکہ تاج الدینؒ باباایک عجیب شان سے جلوہ افروز ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر نیل کنٹھ راؤ صاحب بے ہوش ہوگئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آپ مست و بے خود باباصاحب کی شان میں گیت گاتے رہتے تھے۔

کچھ عرصہ شکردرہ میں رہنے کے بعد بابانیل کنٹھ راؤ جبل پور چلے گئے۔ جبل پور میں ہزاروں لوگوں نے آپ سے فیض پایا۔ ۱۹۳۱ ءمیں آپ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔آپ کی سمادھی ناگپور میں موجود ہے۔

سکّو بائی

شکردرہ میں باباتاج الدینؒ کے پاس گلاب نامی ایک بنجارہ (روئی دھنکنے وہ ۔آیا)اس نے باباصاحب سے عرض کیا۔"حضرت ! میں دونوں آنکھوں سے معذور ہوں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

باباصاحب نے فرمایا۔"اپنے گاؤں میں چراغ رکھ کر یہاں کیوں آیا ہے؟ جا، اور مجھے وہاں دیکھ!"

گلاب اپنے گاؤں واپس گیا اور گھر میں بیٹھا باباصاحب کے ارشاد پر غور کر رہا تھا کہ آنکھوں پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ کوئی ان کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ گلاب نے آثار و شواہد سے اندازہ لگالیا کہ یہ سکو بائی ہیں۔اس وقت سکو بائی کا بچپن تھا۔

گلاب سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو، باباصاحب نے جس شخصیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سکو بائی ہی ہیں۔ ورنہ بغیر بلائے آنے اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرنے کی کیا وجہ ہے۔

سکو بائی گلاب کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر چلی گئیں اور پھر بتدریج گلاب کی بینائی بڑھتے بڑھتے بحال ہو گئی۔ اس واقعہ سے سکو بائیء پورے گاؤں میں مشہور ہو گئیں اور سینکڑوں کی تعداد میں لوگ آپ کے پاس آنے لگے۔

سکو بائی کنبی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور پیدائش مجذوب اور ولی اللہ تھیں۔ آپ ضلع وردھا میں ستّی ماں کے نام مشہور ہوئیں۔

بی اماں صاحبہ

آپ کے والد چاندہ میں مسجد کے پیش امام تھے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ پیش امام صاحب کی بیوی نے منت مانگی کہ اگر اولاد زندہ رہ گئی تو میں اسے باباصاحبؒ کے زیرِ سایہ دے دوں گی۔ چنانچہ بی اماں صاحبہ پیدا ہوئیں۔ اور زندہ رہیں۔ کم سنی میں ان کو باباصاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تو باباصاحبؒ نے آپ کی پرورش اپنے ماموں عبدالرحمٰن صاحب کے سپرد کی۔ جب بی اماں صاحبہ سنِ بلوغ کو پہنچیں تو ان کے رشتے دار انہیں چاندہ لے گئے اور شادی کر دی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد بی اماں صاحبہ پر استغراق کی کیفیت غالب رہنے لگی جس کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے دوبارہ باباصاحب کے سامنے پیش کیا۔ چند روز باباصاحب کے پاس رہیں تو جذب ختم ہو گیا۔

باباصاحبؒ نے ان کی تربیت اور تعلیم فرمائی اور عبدالرحمٰن کا لقب دیا۔ بی اماں صاحبہ نے راجورہ میں قیام کیا اور وہیں آپ کا چشمۂ فیض جاری ہوا۔

حضرت دوّابابا

آپ کا تعلق گورکھپور سے تھا۔ باباتاج الدینؒ کے وصال کے دن ناگپور آئے اور بعض لوگوں کے بیان کے مطابق تین دن بعد ناگپور آئے۔ آپ کو باباصاحبؒ سے روحانی نسبت حاصل تھی۔

حضرت دوابابا تاج آباد میں مقیم رہے۔ اور لوگوں میں آپ کی عقیدت و محبت گھر کرنے لگی۔ اسی زمانے میں آپ پر جذب طاری ہو گیا۔ یکایک جلال میں آکر لوگوں پتھر مارنے لگتے۔ ان دنوں تاج آباد کا انتظام حضرت فریدالدین کے سپرد تھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی شخص دوابابا کے ہاتھوں مارا جائے۔ حضرت فریدالدین بابا تاج الدینؒ کی طرف متوجہ ہو کر ان کے مزار کے پائینتی پر سو گئے۔ خواب میں اشارہ ملا کہ دوابابا کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جائے۔ حضرت فریدالدین زنجیر لے کر دوابابا کے پاس پہنچے۔ دوا بابا صاحب نے انہیں آتا دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے اور زنجیریں پہن لیں۔ لیکن رات کو نجانے کس طرح زنجیروں کی قید سے آزاد ہو کر تاج آباد سے باہر چلے گئے اور پندرہ دن بعد تاج آباد میں دوبارہ نظر آئے۔ حضرت فریدالدین صاحب ان کے پاس اپنے عمل کی معافی مانگنے گئے۔ ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ دوا باباصاحب نے کہا۔ "تیری کوئی خطا نہیں ہے۔ سب باباصاحبؒ کے زیرِ حکم ہیں۔"

ان دنوں ناگپور کے راجہ اعظم شاہ لاولد تھے۔ دوا بابا صاحب کی دعا سے ان کے یہاں کئی اولادیں ہوئیں۔ راجہ اعظم کی درخواست پر دوا بابا صاحب نے ان کے قلعہ میں رہنا قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد وہیں آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ کا جسدِ خاکی راجہ اعظم شاہ کے قلعے سے تاج آباد لایا گیا۔ اور وہیں آپ کا مزار ہے۔

جس طرح بابا تاج الدینؒ کی چلہ گاہ راجہ رگھوجی راؤ کے محل میں ہے اسی طرح دوا بابا صاحب کا چلہ راجہ اعظم شاہ کے محل میں موجود ہے۔

نانی صاحبہ

آپ مجذوب تھیں اور ایک فقیر خاندان سے تعلق تھا۔ اکثر مستانہ وار جھوم جھوم کر بابا تاج الدینؒ صاحب کی شان میں اشعار گاتی تھیں۔ ایک لمبا کُرتا اور لنگوٹ آپ کا لباس تھا۔ نانی صاحبہ کی کوئی بات رموز و نقاط سے خالی نہیں ہوتی تھیں۔ آپ آخری وقت تک تاج آباد میں مقیم رہیں وہیں وصال ہوا اور وہیں دفن کی گئیں۔

عنوانِ حضرت محمد غوث بابا

آپ مدراس سے تعلق رکھتے تھے۔ اور شکر درہ میں اکھاڑے کے پیچھے ایک جھونپڑے میں آپ کا قیام تھا۔ آپ ایک عابد اور سالک تھے۔ اس لئے باباصاحبؒ نے

آپ سے ارشاد و تبلیغ کا کام لیا۔ باباتاج الدینؒ کے روحانی مشن کو آپ نے وجے نگر اور کٹک کے علاقوں میں پھیلایا۔ ان علاقوں کے عوام کے علاوہ بااثر افراد بھی آپ سے فیضیاب ہوئے۔

حضرت محمد غوث بابانے اپنے یہاں ایک چھوٹا سا لنگر خانہ بھی قائم کر رکھا تھا۔ جس سے درویشوں اور محتاجوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ ۳ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ کو آپ وجے نگر سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں انتقال ہو گیا۔ اور جسدِ خاکی شکر درہ لایا گیا۔ باباتاج الدینؒ کے حکم سے راجا باگ سوار کی طرف سردرگا کی تکیہ میں سپردِ خاک کئے گئے۔

قاضی امجد علی

۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ دو سال کی عمر میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو پھوپھی نے گود لیکر پالا۔ پھوپھی کا خاندان ناندورا ضلع بلڈانا (برار) میں آباد تھا۔ مڈل تک پڑھنے کے بعد آگے کی تعلیم کھام گاؤں میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر جی آئی پی ریلوے میں ملازمت کی درخواست دی۔ ٹکٹ کلکٹر کی ملازمت مل گئی۔ اور جلد ہی ترقی کر کے بحیثیت گارڈ بھساول جنکشن پر تعینات کئے گئے۔

قاضی صاحب اپنے ایک ساتھی سید محمد سبحان الدین کے ساتھ باباصاحبؒ کی خدمت میں پہنچے۔ باباصاحبؒ نے آپ کو گیارہ روز تک اپنے پاس رکنے کا حکم دیا۔ گیارہویں دن صبح باباصاحبؒ نے کہا۔ "ریل پر جانے والوں کو بلاؤ۔" بآوازِ بلند یہ بات

پکاری گئی۔ تو صرف قاضی امجد علی ریلوے سے متعلق نکلے۔ قاضی امجد علی باباصاحبؒ کے پاس پہنچے تو انہوں نے قاضی صاحب کے سر و پشت پر دستِ شفقت پھیر کر کہا۔"حضرت جاکوآؤ۔" حسبِ حکم ناگپور سے بھساول پہنچے۔ اگلے دن صبح ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔ لیکن رات کو باباصاحبؒ نے بذریعۂ کشف حکم دیا"واپس آتے جی حضرت۔"آپ پہلی ٹرین سے روانہ ہوئے ۔ باباصاحبؒ اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ باباصاحبؒ نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ اور واپس جانے کا حکم دیا۔ باباصاحبؒ کے پاس قاضی صاحب کی ملازمت کا عجیب حال ہوگیا۔ باباصاحبؒ حکم دیتے کہ "یہیں رہتے جی۔"توآپ ملازمت سے بے نیاز ہو کر باباصاحبؒ کے پاس رہنے لگتے۔اور جب واپسی کا حکم ملتا، دوبارہ ملازمت کی درخواست دیتے اور اسی عہدہ پر بحال کر دیئے جاتے۔ ایک مرتبہ رات میں باباصاحبؒ کی طرف سے حکم ہوا۔"حضرت یہاں آتے جی۔"اگلی صبح ناگپور تبادلہ کا تار ملا۔ ناگپور پہنچے تو باباصاحبؒ نے فرمایا۔"آؤجی ! حضرت، یہیں آم کے درخت کے نیچے رہتے۔ بھٹیار اپکاتا اپن کھاتے۔" قاضی صاحب آم کے درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔اور باباصاحبؒ انہیں نظرِ فیض سے نوازتے رہے۔

قاضی صاحب کی عمر ۲۸ سال کی ہوئی تو باباصاحبؒ نے پھول کا ہار، ایک کتاب اور ایک روپیہ عنایت کر کے کہا۔"حضرت سنت کی پیروی کرتے جی۔ جاکوآؤ۔" قاضی صاحب پھوپھی کے پاس ناندورا پہنچے تو وہ ان کی شادی کے لئے منتظر بیٹھی تھیں۔ قاضی صاحب رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

شادی کے دوسال بعد باباصاحبؒ نے قاضی صاحب سے کہا۔"بہت کھانے لگا رے۔ آج سے تیرا کھانا بند۔ تین کپ کالی چائے پیتے، اچھے رہتے۔"نوّے دن کے بعد باباصاحبؒ نے فرمایا۔"اب تو صحیح ہوگیا رے۔ کھاتے پیتے اچھے رہتے۔" باباصاحبؒ

کے وصال کے بعد قاضی صاحب پر جذبی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ایک روز باباصاحبؒ نے حکم دیا۔"حضرت دنیا میں رہ کر دنیا کے کام کرتے۔اچھے رہتے۔" چنانچہ ناگپور سے ناندورا گئے۔ ہومیو پیتھی کا کورس کر کے ڈاکٹر سند حاصل کی اور علاج معالجہ کے ذریعے خدمتِ خلق کی طرف رجوع ہوئے۔

باباصاحبؒ کے حکم پر بمبئی گئے۔اور وہاں بھی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب پاکستان کا قیام وجود میں آیا تو قاضی صاحب کراچی آ گئے۔اور باباصاحبؒ کی تعلیمات کو پھیلانے اور نذر و نیاز کا اہتمام جاری رکھا۔

وصال سے پہلے قاضی صاحب نے کھانا بند کر دیا اور نوے دن تک کچھ نہیں کھایا بالآخر ۱۵؍ ربیع الثانی ۱۳۷۸ ھ مطابق ۲۸؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء قاضی صاحب نے پردہ فرمالیا۔ سی۔ون ایریا۔لیاقت آباد کے قبرستان میں آپ کا مزار ہے۔

حضرت فریدالدین کریم بابا

آپ کاٹھیاوار کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بچپن ہی میں بابا تاج الدینؒ کے پاس حاضر ہو گئے تھے۔ بابا تاج الدینؒ سے مستفیض ہونے کے علاوہ آپ نے باباصاحبؒ کے دیگر فیض یافتگان سے بھی کسبِ فیض کیا۔ باباصاحبؒ کے حکم سے حکیم نعیم الدین کے خدمت میں رہ کر تصوف کے علاوہ طب اور دواسازی کی تعلیم حاصل کی۔ خواجہ علی امیر الدین کے پاس بھی رہے۔آپ کو بابا تاج الدینؒ سے گہرا قلبی لگاؤ رہا۔ کریم بابا نے بابا تاج الدینؒ کے حالات و کشف و کرامات پر مبنی ایک کتاب "تاج مراری" بھی

تالیف کی۔ آج کل آپ تاج آباد کمیٹی کے صدر ہیں۔ تاج آباد کمیٹی باباتاج الدینؒ کی درگاہ اور عرس کے انتظامات کرتی ہے۔

حضرت فریدالدین تاجی (کریم باباصاحب) اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔
جھانسی سے ایک صوفی صاحب باباصاحبؒ سے ملاقات کے لئے شکردرہ آئے۔ صوفی صاحب کا قیام میرے ساتھ تھا۔ اور ہم دونوں میں ہر وقت تصوف اور روحانیت پر گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ "کیا کوئی ایسا آسان طریقہ ہے، جس کے ذریعے مجھ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ میں عرفان کی منزل کو تیزی سے عبور کرلوں۔" انہوں نے ایک عمل بتاتے ہوئے کہا کہ اس عمل کو کسی قبرستان میں کرو۔ جذبۂ شوق سے مغلوب ہوکر میں قبرستان جاکر یہ عمل کرنے لگا۔ تیسرے روز آنکھیں بند کئے اپنے عمل میں مشغول کہ مجھے محسوس ہوا کہ باباصاحبؒ خفگی میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھے پکار رہے ہیں۔ میں نے کھول کر چاروں طرف دیکھا تو باباصاحبؒ مجھے دکھائی نہ دیئے۔ میں دوبارہ آنکھیں بند کرکے عمل میں غرق ہوگیا۔ جیسے ہی عمل شروع کیا باباصاحبؒ کی غصہ بھری آواز کان میں پڑی۔ گویا آپ مجھے منع فرمارہے ہیں۔ میں اٹھا اور شکردرہ تالاب کے کنارے کنارے چلتا ہوا باباصاحبؒ کی نشست گاہ کی طرف بڑھا۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ جونہی میں اپنے پرانے جھونپڑے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ آم کے درخت کے نیچے باباصاحبؒ موجود ہیں۔ بابا نے مجھ سے کہا۔ "کیوں رے! کون بولا بڑے بڑے پہاڑاں کھودنے کو؟ یہ ماچس لے۔"

باباصاحبؒ نے ماچس مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔ "کاہے کورے اِدھر اُدھر ڈھونڈھتا ہے۔" پھر آپ نے کچھ الفاظ ادا فرمائے جو مجھے سمجھ میں نہ آئے۔ دل ہی دل

میں عرض کیا۔" حضور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے کیا فرمایا۔" دل میں اس خیال کے آتے ہی باباصاحبؒ نے ایک طمانچہ مجھے مارا اور فرمایا۔" ذہن چراتا ہے۔"

باباصاحبؒ نے برابر کھڑے ہوئے ایک صاحب کے کندھے سے شال لیکر دو پلو میرے ہاتھ میں دیئے اور دو پلو خود پکڑ کر فرمایا۔" بچھا، یہ ہے دوکان ۔

مثنویٰ مادکانِ وحدت است وحدت اندر وحدت اندر وحدت است

جب باباصاحبؒ نے مجھے ماچس دی تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جس طرح ماچس کی تیلی میں شعلۂ نور چھپا ہوا ہے اسی طرح اللہ کو نور بھی میرے اندر موجود ہے۔اللہ کو اپنے پاس رکھ کر ادھر اُدھر ڈھونڈنا اور خود سے الگ سمجھنا لاحاصل ہے۔جب انسان خود کو پہچان لیتا ہے تو اس ہستی کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔جس نے خود کو متعارف کرانے کے لئے کائنات کو وجود کا لباس پہنایا ہے۔

قلندر باباولیاء

آپ کانام محمد عظیم، تخلص برخیااور لقب قلندر باباولیاء ہے۔ قلندر بابار شتہ میں باباتاج الدینؒ ناگپور کے نواسے ہیں۔ قلندر باباولیاء۱۸۸۹ ءمیں قصبہ خورجہ ضلع بلند شہر یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ قرآنِ پاک اور ابتدائی تعلیم محلہ کے مکتب میں حاصل کی۔ ہائی اسکول تک بلند شہر میں پڑھااور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انٹر میں داخلہ لے لیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران آپ کی طبیعت میں درویشی کی طرف میلان پیدا ہو گیا۔ اسی اثنا میں قلندر بابا اپنے نانا باباتاج الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نانا نے انہیں اپنے پاس روک لیا۔ قلندر باباکے والد کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ ناگپور گئے اور باباتاج الدینؒ سے عرض کیا۔ اسے علی گڑھ واپس بھیج دیجئے۔ اس کی تعلیم نامکمل رہ جائے گی۔

استادوں کے استاد واقفِ اسرار و رموز، حاملِ علمِ لدنی، باباتاج الدینؒ نے فرمایا کہ "اگر اس سے زیادہ اسے پڑھایا گیا، جتنا یہ اب تک پڑھ چکا ہے تو یہ میرے کام کا نہیں رہے گا۔"

قلندر باباکے والد نے ایک مشفق باپ کی طرح بیٹے کو سمجھایا۔ اور جب دیکھا کہ بیٹے کا میلان فقر کی طرف ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر "بیٹے تم خود سمجھ دار ہو۔ جس طرح چاہو اپنا مستقبل تعمیر کرو۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔"

قلندر باباؒاولیاء باباتاج الدینؒ کے پاس نو سال مقیم رہے۔ باباتاج الدینؒ نے نو سال تک ان کی روحانی تربیت فرمائی۔ تربیت کے زمانے میں ہونے والے بیشمار واقعات میں سے چند واقعات کا تذکرہ اور علمی توجیح قلندر بابا نے کتاب "تذکرہ تاج الدینؒ" میں کی ہے۔ تربیت کے زمانے میں قلندر بابا کی والدہ سعیدہ بی بی چار بیٹیوں اور دو بیٹوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ قلندر بابا اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی تربیت اور نگہداشت پر کمربستہ ہو گئے اور بچیوں کی تربیت کے سلسلے میں دقت پیش آئی تو باباتاج الدینؒ کے ارشاد کے مطابق ان کے ایک عقیدت مند کی صاحب زادی سے دہلی میں آپ کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد قلندر بابا دہلی میں قیام پذیر ہو گئے۔ سلسلۂ معاش قائم رکھنے کے لئے مختلف رسائل اور جرائد کی صحافت اور شعراء کے دیوانوں کی اصلاح اور ترتیب کا کام اپنے لئے منتخب کیا۔

تقسیمِ ہند کے بعد قلند بابا اپنے والد بہن بھائیوں اور اہل وعیال کے ساتھ کراچی آ گئے۔ اور بی مارکیٹ میں ایک خستہ حال مکان کرائے پر لیا۔ کچھ عرصہ بعد کمشنر بحالیات خاں بہادر عبداللطیف نے جو باباتاج الدینؒ کے عقید تمند تھے قلندر بابا سے کہا کہ ایک درخواست لکھ دیجئے تاکہ آپ کے لئے کوئی اچھا سا مکان الاٹ کر دیا جائے۔ قلندر بابا نے اس درخواست پر توجہ نہ دی۔ اور اسی مکان میں رہتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد آپ اردو ڈان میں سب ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اس کے بعد ایک عرصہ تک رسالہ نقاد میں کام کرتے رہے۔ کچھ رسالوں کے ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اور کئی مشہور کہانیوں کے سلسلے بھی قلم بند کئے۔

۱۹۵۶ ءمیں سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ، خطب ارشاد حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردی کراچی تشریف لائے۔ قلندر باباان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت ہونے کی درخواست کی۔ حضرت ابوالفیض نے رات کو تین بجے آنے کو کہا۔ سخت سردی کے عالم میں قلندر بابا گرانڈ ہوٹل ہیکلوڈ روڈ کی سیڑھیوں پر رات کے دو بجے جا کر بیٹھ گئے۔ ٹھیک تین بجے سہروردی بزرگ باہر آئے اور ساتھ لے کر کمرے میں اندر پہنچے ۔ سامنے بٹھا کر تین پھونکیں ماریں۔ پہلی پھونک میں عالمِ ارواح منکشف ہو گیا۔ دوسری پھونک میں عالمِ ملکوت و جبروت سامنے آگیا اور تیسری پھونک میں قلندر بابااولیاء نے عرشِ معلی کا مشاہدہ کیا۔

حضرت ابوالفیض سروردی نے تین ہفتہ میں کتب ارشاد کی تعلیمات دے کر خلافت عطا کر دی۔ اس کے بعد شیخ نجم الدین کبریٰ کی روح پر فتوح نے قلندر بابا کی روحانی تعلیم شروع کی اور پھر یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہِ راست علمِ لدنی عطا کی۔ فرمایااور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہمت اور نسبت کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں پیشی ہوئی۔ اور اسرار ورموز کا علم حاصل ہوا۔ اس زمانے میں قلندر بابااولیاء نے مسلسل دس رات اور دس دن شبِ داری کی اور تہجد کی نوافل میں کئی کئی سو مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی۔

سلسلۂ عظیمیہ:

ہر زمانہ میں یہ طریقہ رہا ہے کہ طالبِ حق کسی عارف بزرگ سے بیعت ہوتا ہے تو وہ بزرگ کسی نہ کسی راستے سے قدم قدم چلا کر اسے عرفانِ خداوندی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ اصول و قوانین اور روحانی راستے کسی سلسلے کا تعین کرتے ہیں۔ گروہ اولیاء اللہ میں سے منتخب اور اکابر حضرات نے ہر زمانے میں طالبانِ حق کی عمومی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر اسباق و اذکار مرتب کئے ہیں۔ ہر زمانے میں نوعِ انسانی کی شعوری، علمی اور جسمانی صلاحیتوں میں فرق رہا ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ حالات اور ضروریات میں تبدیلی ہوتی گئی۔ چنانچہ یہ لازمی ہو گیا کہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ اسباق اور اذکار میں مناسب تبدیلی کی جائے تا کہ طالبانِ حق کو ان پر عمل پیرا ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔

علوم و فنون کی معجزہ صفت ترقیوں نے نوعِ انسان کی شعوری صلاحیتوں کو بہت بڑھا دیا ہے۔ انسان کی فکری سطح بھی بلند ہو گئی ہے۔ وہ کیوں اور کیسے کا جواب سننا چاہتا ہے۔ اس ذہنی ارتقا کے ساتھ یہ بات ضروری ہو گئی ہے کہ تصوف کی تعلیمات اور روحانیت کے علم کو جدید نہج پر پیش کیا جائے۔ وہ علوم جنہیں کبھی وقت کی ضرورت کے تحت "علمِ سینہ" کہہ کر مخصوص حضرات کو منتقل کیا جاتا تھا۔ اب نوعِ انسان کا اجتماعی

ذہن اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ ان علوم کو سن اور سمجھ سکے۔ آج کے سائنسی دور میں کوئی بات اس وقت قابلِ قبول ہوتی ہے جب اسے فطرت کے مطابق اور سائنسی توجیہات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسی بات کی پیشِ نظر رکھتے ہوئے ابدالِ حق قلندر باباؔاولیاءؒ نے سلسلۂ عظیمیہ کا مشن یہی ہے کہ لوگوں کے اوپر تفکر کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ حالاتِ حاضرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سلسلۂ عظیمیہ نے اسباق اور اذکار میں تبدیلی کرکے اسے بہت مختصر اور آسان کر دیا ہے۔

باباتاج الدینؒ اولیاء کے فیضِ روحانی اور علم معرفت کو سلسلۂ عظیمیہ نے سائنسی بنیادوں پر نئے رنگ اور نئی شان سے متعارف کرایا ہے۔ آنے والی نسل کے لئے روحانی سائنس ایک باقاعدہ تحریک بن گئی ہے باباتاج الدینؒ ناگپوری سے فیض یافتہ انکے نواسے قلندر باباکا مشن ہندوپاکستان سے نکل کر ایشیا اور یورپ کے ملکوں میں تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے۔

لوح و قلم:

قلندر باباؔاولیاءؒ نے جو تحریری سرمایہ چھوڑا ہے اس میں کتاب "لوح و قلم" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں روحانیت کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان سب میں ترغیبی اور تبلیغی مواد موجود ہے لیکن ان قوانین اور فارمولوں کو بیان کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ جو تخلیق اور تسخیرِ کائنات سے متعلق ہیں۔ آج کے دور میں جب انسان کا ذہن بالیدگی کے اس نقطے پر پہنچ چکا ہے کہ وہ روحانیت کو علمی بنیادوں پر سمجھ سکے۔ قلندر باباؔاولیاءؒ نے علم روحانیت اور کائنات کی تخلیق میں جاری و ساری قوانین کو عام فہم زبان میں لکھوایا۔ اور اس طرح جو کتاب تیار ہوئی اس

کا نام "لوح و قلم" رکھا گیا۔ لوح و قلم کے مطالعے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کے تخلیق مراحل نگاہوں کے سامنے آگئے ہیں۔ قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ کتاب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر لکھوائی جو بطریقِ اویسیہ ملا۔

نقشے اور گراف:

لوح و قلم کی اضافی تشریح کرتے ہوئے قلندر بابا اولیاءؒ نے بہت سے نقشے، تصاویر، اشکال اور گراف بنا کر دیئے۔ یہ اشکال اور نقشے ارض و سماوات اور عالمِ ملکوت وجبروت کے تخلیقی فارمولوں پر مشتمل ہیں۔ نیز ان میں مقاماتِ ارضی وسماوی کا خاکہ بھی موجود ہے۔

رباعیات:

قلندر بابا اولیاءؒ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ شعر و سخن کا ذوق آپ نے بچپن سے پایا تھا۔ قلندر باباؒ نے بہت سے رباعیات کہیں جن میں معرفت کے نکات، آدمِ خاکی کی حیثیت اور عالمِ رنگ و بُو کی حقیقت کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ ان رباعیات میں جو گہرائی ہے وہ مقام ولایت و عرفان میں آپ کی عظمت کی گواہی دیتی ہے۔ چند رباعیات پیشِ خدمت ہیں:

جس پردے میں دیکھتا ہوں پردا ہے الگ
جس نقش میں دیکھتا ہوں نقشہ ہے الگ
ہر ذرہ میں جمشید و فریدوں ہیں ہزار
سبحان اللہ کہ میری دنیا ہے الگ

زلفیں ہیں ہزار مشک اور عنبر میں

ہیں سینکڑوں رخسار جو ہیں گوہر میں

اس راہ میں رکھ پیر ذرا آہستہ

آنکھیں ہیں ہزار پری زادوں کی خاکستر میں

نبی سے صادر ہونے والا معجزہ ہو یا ولی سے سرزد ہونے والی کرامت سب کسی نہ کسی قانون کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ سے متعلق تذکرے اس امتیاز سے لکھے گئے ہیں کہ ان حضرات کی اصل صفات چھپ گئی ہیں اور اس طرزِ فکر کو اجاگر نہیں کیا گیا ہے جو کشف و کرامت کی محرک ہوتی ہے۔ کشف و کرامت کے قانون یا کشف و کرامت کی سائنس کو متعارف کرانے کے لئے۔ قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنے نانا باباتاج الدینؒ ناگپوری کا تذکرہ بعنوان "تذکرہ تاج الدین باباؒ" لکھوایا۔ تذکرے میں ان واقعات کو بیان کیا ہے جو قلندر بابا اولیاءؒ کے سامنے پیش آئے۔

"تذکرہ تاج الدینؒ بابا" کی افادیت کے پیشِ نظر ہم اس کتابچہ کو قلندر بابا کے تذکرے کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں۔ تاکہ قارئین جو پوری کتاب سے گزر کر باباتاج الدینؒ کی ہمہ صفت ذات سے متعارف ہو چکے ہیں۔ اس تذکرے کو پڑھ کر حضرت باباتاج الدینؒ سے صادر ہونے والی کرامات کی علمی توجیہ سے بھی واقفیت حاصل کر لیں۔

تذکرہ

تاج الدین باباؒ

(حصہ اول)

قلندر حسن اخریٰ محمد عظیم برخیاؒ

(نواسا بابا صاحب)

شائع کردہ

مکتبہ تاج الدینؒ بابا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ایک مختصر تذکرہ ہے اس بات سے متعلق کہ اولیاءاللہ کس طرح سوچتے ہیں اور ان کی باتوں کا اہم موضوع ہوتا ہے۔ نانا تاج الدینؒ کی کرامتوں کا تذکرہ سب سے پہلے گجراتی زبان کی ایک تالیف میں کیا گیا تھا۔ بعد میں ہندی اور اردو میں وہ نسخے مرتب ہوئے جن میں کچھ تو گجراتی زبان کی تالیف سے اخذ کیا گیا اور کچھ روایت کے طور پر بہت سے حضرات کے بیان کردہ واقعات اضافہ کئے گئے۔ تاہم کسی تذکرہ میں ان مخفی علوم کو نقطۂ نظر نہیں بنایا گیا تھا جن کا تعلق نانا رحمۃ اللہ علیہ کے ذوقِ طبیعت اور قدرت کی رازداری سے ہے۔ وہ صرف خصوصی مسائل ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اپنی گفتگو کے اندر ایسے مرکزی نقطے بیان کر جاتے تھے جو براہِ راست قانونِ قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہیں۔ بعض اوقات اشاروں اشاروں ہی میں وہ ایسی بات کہہ جاتے جس میں کرامتوں کی علمی توجیہ ہوتی اور سننے والوں کی آنکھوں کے سامنے یکبارگی کرامت کے اصولوں کا نقشہ آ جاتا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے ذہن سے تسلسل کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں روشنی کی لہریں منتقل ہو رہی ہیں اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرین من و عن ہر وہ بات اپنے ذہن میں سمجھتے اور محسوس کرتے چلے جاتے ہیں جو نانا رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن میں اس وقت گشت کر رہی ہے۔ بغیر توجہ دیئے بھی ان کی غیر ارادی توجہ لوگوں کے اوپر عمل کرتی رہتی تھی۔ بعض لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے باباصاحب کے اس طرزِ ذہن سے بہت فیضان حاصل کیا ہے۔ یہ بات تو بالکل ہی عام تھی کہ چند آدمیوں کے ذہن میں کوئی بات آئی اور یکایک نانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دے دیا۔ اردو بولنے میں انہیں اکثر سوچنا پڑتا۔ پھر بھی الفاظ میں کچھ ایسا زور ہوتا کہ سامعین ان کا مافی الضمیر فوراً سمجھ جاتے۔

انسان، فرشتے اور جنات:

مرہٹہ راجہ رگھوراؤ ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور کوئی درخواست کرتا تو اس طرح جیسے دیوتاؤں کے حضور میں۔ ایک مرتبہ انہوں نے راجہ کے مندر کا بت توڑ ڈالا۔ پجاریوں نے شور مچادیا۔ لیکن راجہ صورتِ حال سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔ محل والوں کی شکایت پر راجہ نے مسکرا کر فقط ایک جملہ کہا۔ "باباصاحبؒ بھی دیوتا ہیں۔ یہ معاملہ دیوتاؤں کا ہے، آپس میں خود نمٹ لیں گے۔ ہمارا تمہارا بولنا بے ادبی ہے۔" اس جملہ سے محض راجہ کی عقیدت کا ہی نہیں اس طرزِ فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو روحانی شخصیتوں کے بارے میں راجہ کے ذہن میں تھی۔ جو لوگ روحانی قدروں سے کچھ بھی مانوس ہیں وہ اتنا ضرور جان سکتے ہیں کہ راجہ مخفی علوم سے مس رکھتا تھا اور اس کے اندر فیضان حاصل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ یہاں وہ چند باتیں پیش کرنا بھی ضروری ہیں جو میری موجودگی میں راجہ اور نانا رحمۃ اللہ علیہ میں ہو اکرتی تھیں۔ ان اوقات میں کوئی اور صاحب بھی سوال کرلیا کرتے اور پوری مجلس جواب سے مستفیض ہوتی۔ ایک مرتبہ مہاراجہ نے سوال کیا۔ "باباصاحبؒ! ایسی مخلوق جو نظر نہیں آتی مثلاً فرشتہ یا جنات، خبر متواتر رکھتی ہے۔ جتنی آسمانی کتابیں ہیں ان میں اس قسم کی مخلوق کے تذکرے ملتے ہیں۔ ہر مذہب میں بدروحوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے لیکن عقلی اور علمی توجیہات نہ ہونے سے ذی فہم انسانوں کو سوچنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے رکتے ہیں کہ ہم سمجھ گئے۔ تجربات جو کچھ زبان زد ہیں، وہ انفرادی ہیں، اجتماعی نہیں۔ آپ اس مسئلہ پر کچھ ارشاد فرمائیں۔"

نانا رحمۃاللہ علیہ نے اس بات میں کچھ فرمایا وہ فقط تبصرہ نہیں بلکہ میرے اندازے میں ایسے الہامات کا مجموعہ ہے، قدرت نے ان کی ذات کو جن کا مرکز بنایا تھا۔ صاحبِ فراست انسانوں کے لئے یہ ملفوظات حد درجہ محلِ تفکر ہیں۔ان کے جواب سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قدرت اوران کے ذہن کی سطح قریب قریب ایک ہے۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مسئلہ کی وضاحت جن خیالات کے ذریعے کی گئی ہے وہ قدرت کے رازوں میں کس طرح سمائے ہوئے ہیں۔ جس وقت یہ سوال کیا گیا۔ ناناتاج الدینؒ لیٹے ہوئے تھے۔ان کی نگاہ اوپر تھی۔ فرمانے لگے۔ "میاں رگھوراؤ! ہم سب جب سے پیدا ہوئے ہیں، ستاروں کی مجلس کو دیکھتے رہتے ہیں، ہم آسمانی دنیا سے روشناس ہیں۔ لیکن ہم کیا دیکھ رہے ہیں اور ماہ وانجم کی کون سی دنیا سے روشناس ہیں۔اس کی تشریح ہمارے بس کی بات نہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں قیاس آرائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی سمجھتے یہی ہیں کہ ہم جانتے ہیں۔ زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ جب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کچھ نہ کچھ جانتا ہے تو یہ قطعاً نہیں سوچتے کہ اس دعوے کے اندر حقیقت ہے یا نہیں۔"

فرمایا۔" جو کچھ میں نے کہا اسے سمجھو، پھر بتاؤ کہ انسان کا علم کس حد تک مفلوج ہےً۔ انسان کچھ نہ جاننے کے باوجود اس کا یقین رکھتا ہے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ یہ چیزیں دور پرے کی ہیں۔ جو چیزیں ہر وقت انسان کے تجربے میں ہیں۔ان پر بھی نظر ڈالتے جاؤ۔ دن طلوع ہوتا ہے۔ دن کا طلوع ہونا کیا شئے ہے، ہمیں نہیں معلوم۔ طلوع ہونے کا مطلب کیا ہے ہم نہیں جانتے۔ دن رات کیا ہیں ؟اس کے جواب میں اتنی بات کہہ دی جاتی ہے کہ یہ دن ہے۔اس کے بعد رات آتی ہے۔ نوعِ انسانی کا یہی تجربہ ہے۔

میاں رگھوراؤ، ذرا سوچو کیا سنجیدہ طبیعت انسان اس جواب پر مطمئن ہو جائے گا؟ دن راتً، فرشتے نہیں ہیں، جنات نہیں ہیں، پھر بھی وہ مظاہر ہیں جن سے ایک فردِ واحد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تم اتنا کہہ سکتے ہو کہ دن رات کو نگاہ دیکھتی ہے، اس لئے قابلِ یقین ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ نگاہ کے ساتھ فکر بھی کام کرتی ہے۔ اگر نگاہ کے ساتھ فکر کام نہ کرے تو زبان نگاہ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ نگاہ اور فکر کا عمل ظاہر ہے۔ دراصل سارے کا سارا عمل تفکر ہے۔ نگاہ محض ایک گونگا ہیولیٰ ہے۔ فکر ہی کے ذریعے تجربات عمل میں آتے ہیں۔ تم نگاہ کو تمام حواس پر قیاس کر لو۔ سب کے سب گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ تفکر ہی حواس کو سماعت اور بصارت دیتا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ حواس تفکر سے الگ کوئی چیز ہے حالانکہ تفکر سے الگ ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان محض تفکر ہے۔ فرشتہ محض تفکر ہے۔ جن محض تفکر ہے۔ علیٰ ہذا لقیاس ہر ذی ہوش تفکر ہے۔

فرمایا کہ اس گفتگو میں ایک ایسا مقام آجاتا ہے جہاں کائنات کے کئی راز منکشف ہو جاتے ہیںً۔ غور سے سنو، ہمارے تفکر میں بہت سی چیزیں ابھرتی رہتی ہیں۔ دراصل وہ باہر سے آتی ہیں۔ انسان کے علاوہ کائنات میں اور جتنے تفکر ہیں جن کا تذکرہ ابھی کیا گیا ہے۔ فرشتے اور جنات۔ ان سے انسان کا تفکر اسی طرح متاثر ہوتا رہتا ہے جس طرح انسان خود اپنے تفکر سے متاثر ہوتا ہے۔ قدرت کا چلن یہ ہے کہ وہ لامتناہی تفکر سے تناہی تفکر کو فیضان پہنچاتی رہتی ہے۔ پوری کائنات میں اگر قدرت کا یہ فیضان جاری نہ ہو تو کائنات کے افراد کا یہ درمیانی رشتہ کٹ جائے۔ ایک تفکر کا دوسرے تفکر کو متاثر کرنا بھی قدرت کے اس طرزِ عمل کا ایک جزو ہے۔ یہ تفکر تین قسم کے ہیں اور تینوں کائنات

ہیں۔ اگر یہ تینوں مربوط نہ رہیں اور ایک تفکر کی لہریں دوسرے تفکر کو نہ ملیں تو ربط ٹو ٹ جائے گا اور کائنات منہدم ہو جائے گی۔

ثبوت یہ ہے کہ ہمارا تفکر ہیولیٰ اور ہیولیٰ قسم کے تمام جسموں سے فکری طور پر روشناس ہے۔ ساتھ ہی ہمارا تفکر نور اور نور کی ہر قسم سے بھی فکری طور پر روشناس ہے حالانکہ ہمارے اپنے تفکر کے تجربات پابگِل ہیں۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ ہیولیٰ اور نور کے تجربات اجنبی تفکر سے ملے ہیں۔

عام زبان میں تفکر کو انا کا نام دیا جاتاہے اور انا یا تفکر ایسی کیفیات کا مجموعہ ہوتاہے کہ جن کو مجموعی طور پر فرد کہتے ہیں۔ اس طرح کی تخلیق ستارے بھی ہیں اور ذرے بھی۔ ہمارے شعور میں یہ بات یاتو بالکل نہیں آتی یا بہت کم آتی ہے کہ تفکر کے ذریعے ستاروں ذروں اور تمام مخلوق سے ہمارا تبادلۂ خیال ہوتا رہتاہے۔ ان کی انا یعنی تفکر کی لہریں بھی بہت کچھ دیتی ہیں اور ہم سے بہت کچھ لیتی بھی ہیں۔ تمام کائنات اس قسم کے تبادلۂ خیال کا ایک خاندان ہے۔ مخلوق میں فرشتے اور جنات ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ تفکر کے اعتبار سے ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ اور تبادلۂ خیال کے لحاظ سے ہم سے زیادہ مانوس ہیں۔"

ناناتاج الدین اس وقت ستاروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے کہکشانی نظاموں اور ہمارے درمیان بڑا مستحکم رشتہ ہے۔ پے در پے جو خیالات ہمارے ذہن میں آتے ہیں وہ دوسرے نظاموں اوران کی آبادیوں سے ہمیں وصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خیالات روشنی کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ روشنی کی چھوٹی بڑی شعاعیں خیالات کے لاشمار تصویر خانے لے کر آتی ہیں۔ ان ہی تصویر خانوں کو ہم اپنی زبان میں توہم، خیال، تصور اور تفکر وغیرہ کانام دیتے ہیں۔ سمجھا یہ جاتاہے کہ یہ ہماری اپنی اختراعات ہیں۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تمام مخلوق کی سوچنے کی طرزیں ایک نقطۂ مشترک رکھتی ہیں۔ وہی نقطۂ مشترک تصویر خانوں کو جمع کرکے ان کا علم دیتا ہے۔ یہ علم نوع اور فرد کے شعور پر منحصر ہے۔ شعور جو اسلوب اپنی انا کی اقدار کے مطابق قائم کرتا ہے تصویر خانے اس ہی اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تین نوعوں کے طرزِ عمل میں زیادہ اشتراک ہے۔ ان ہی کا تذکرہ قرآنِ پاک میں انسان، فرشتہ اور جنات کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ نوعیں کائنات کے اندر سارے کہکشانی نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔ قدرت نے کچھ ایسا نظام قائم کیا ہے جس میں یہ تین نوعیں تخلیق کا رکن بن گئی ہیں۔ ان ہی کے ذہن سے تخلیق کی لہریں خارج ہو کر کائنات میں منتشر ہوتی ہیں اور جب یہ لہریں معین مسافت طے کرکے معین نقطہ پر پہنچتی ہیں تو کائناتی مظاہر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ تفکر، انا اور شخص ایک ہی چیز ہے۔ الفاظ کی وجہ سے ان میں معانی کا فرق نہیں کر سکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ انا، تفکر اور شخص ہیں کیا؟ یہ وہ ہستی ہیں جو لاشمار کیفیات کی شکلوں اور سراپا سے بنی ہیں۔ مثلاً بصارت، سماعت، تکلم، محبت، رحم، ایثار، رفتار، پرواز وغیرہ۔ ان میں ہر ایک کیفیت ایک شکل اور سراپا رکھتی ہے۔ قدرت نے ایسے بے حساب سراپا لے کر ایک جگہ اس طرح جمع کر دیئے ہیں کہ الگ الگ پرت ہونے کے باوجود ایک جان ہو گئے ہیں۔ ایک انسان کے ہزاروں جسم ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس جنات اور فرشتوں کی بھی یہی ساخت ہے۔ یہ تینوں ساخت اس لئے مخصوص ہیں کہ ان میں کیفیت کے پرت دوسرے انواع سے زیادہ ہیں۔ کائنات کی ساخت میں ایک پرت بھی ہے اور کثیر تعداد پرت بھی ہیں۔ تاہم ہر نوع کے افراد میں مساوی پرت ہیں۔

انسان لاشمار سیّاروں میں آباد ہیں۔ اوران کی قسمیں کتنی ہیں اس کا اندازہ قیاس سے باہر ہے۔ یہی بات فرشتوں اور جنات کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ انسان ہوں، جنات ہوں یا فرشتے، ان کے سراپا کا ہر فرد ایک پائندہ کیفیت ہے۔ کسی پرت کی زندگی جلی ہوتی ہے یا خفی۔ جب پرت کی حرکت جلی ہوتی ہے تو شعور میں آجاتی ہے، خفی ہوتی ہے تو لاشعور میں رہتی ہے۔ جلی حرکت کے نتائج کو انسان اختراع وایجاد کہتا ہے لیکن خفی حرکت کے نتائج شعور میں نہیں آتے۔ حالانکہ وہ زیادہ عظیم الشان اور مسلسل ہوتے ہیں۔ یہاں یہ راز غور طلب ہے کہ ساری کائنات خفی حرکت کے نتیجے میں رونما ہونے والے مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ البتہ یہ مظاہر محض انسانی لاشعور کی پیداوار نہیں ہیں۔ انسان کا خفی کائنات کے دور دراز گوشوں سے مسلسل ربطہ قائم نہیں رکھ سکا۔ اس کمزوری کی وجہ نوعِ انسان کے اپنے خصائل ہیں۔ اس نے اپنے تفکر کو کس مقصد کے لئے پابگل کیا ہے یہ بات اب تک نوعِ انسانی کے شعور سے ماوراء ہے۔ کائنات میں جو تفکر کام کررہا ہے، اس کا تقاضہ کوئی ایسی مخلوق پورا نہیں کرسکی جو زمانی، مکانی فاصلوں کی گرفت میں بے دست وپا ہو۔ اس شکل میں ایسی تخلیق کی ضرورت تھی جو اس کے خالی گوشوں کو مکمل کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ چنانچہ کائناتی تفکر سے جنات اور فرشتوں کی تخلیق عمل میں آئی تاکہ خلاپر ہو جائے۔ فی الواقع انسانی تفکر سے وہ تمام مظاہر رونما نہیں ہوسکے جن سے کائنات کی تکمیل ہو جاتی۔

کائنات زمانی مکانی فاصلوں کا نام ہے۔ یہ فاصلے انا کی چھوٹی بڑی مخلوط لہروں سے بنتے ہیں۔ ان لہروں کا چھوٹا بڑا ہونا ہی تغیر کہلاتا ہے۔ دراصل زمان اور مکان دونوں اسی تغیر کی صورتیں ہیں۔ دخان جس کے بارے میں دنیا کم جانتی ہے اس مخلوط کا نتیجہ اور مظاہر کی اصل ہے۔ یہاں دخان سے مراد دھواں نہیں ہے۔ دھواں نظر آتا ہے اور

دخان ایسادھواں ہے جو نظر نہیں آتا۔انسان مثبت دخان کی اور جنات منفی کی پیداوار ہیں۔ رہا فرشتہ ، ان دونوں کے ملخص سے بنا ہے۔ عالمین کے یہ تین اجزائے ترکیبی غیب وشہود کے بانی ہیں۔ان کے بغیر کائنات کے گوشے امکانی تموّج سے خالی رہتے ہیں۔ نتیجہ میں ہمارا شعور اور لاشعور حیات سے دور نابود میں گم ہو جاتا ہے۔ ان تین نوعوں کے درمیان عجیب وغریب کرشمہ برسرِ عمل ہے۔ مثبت دخان کی ایک کیفیت کا نام مٹھاس ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار انسانی خون میں گردش کرتی رہتی ہے۔ دخان کی منفی کیفیت نمکین ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار جنات میں پائی جاتی ہے۔ ان ہی دونوں کیفیتوں سے فرشتے بنتے ہیں۔ اگر ایک انسان میں مثبت کیفیت کم ہو جائے اور منفی بڑھ جائے تو انسان میں جنات کی تمام صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اور وہ جنات کی طرح عمل کرنے لگتا ہے۔ اگر کسی جن میں مثبت کیفیت بڑھ جائے اور منفی کیفیت کم ہو جائے تو اس میں ثقل وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ فرشتہ پر بھی یہی قانون نافذ ہے۔ اگر مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے اوپر آجائیں تو مثبت کے زور پر وہ انسانی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے اور منفی کے زور پر جنات کی۔ بالکل اسی طرح اگر انسان میں مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے کم ہو جائیں تو اس سے فرشتہ کے اعمال صادر ہونے لگیں گے۔

طریقِ کار بہت آسان ہے۔ مٹھاس اور نمک کی معین مقدار کم کر کے فرشتوں کی طرح زمانی مکانی فاصلوں سے وقتی طور پر آزاد ہو سکتے ہیں۔ محض مٹھاس کی مقدار کم کر کے جنات کی طرح زمانی مکانی فاصلے کم کر سکتے ہیں لیکن ان تدبیروں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی روحانی انسان کی رہنمائی اشد ضروری ہے۔

شیر کی عقیدت:

ایک دن واکی شریف کے جنگل میں پہاڑی ٹیّے پر چند لوگوں کے ہمراہ چڑھتے چلے گئے۔ نانا رحمۃ اللہ علیہ مسکرا کر کہنے لگے۔ "میاں جس کو شیر کا ڈر ہو وہ چلا جائے، میں تو یہاں ذرا سی دیر آرام کروں گا۔ خیال ہے کہ شیر ضروری آئے گا۔ جتنی دیر قیام کرے اس کی مرضی۔ تم لوگ خواہ مخواہ انتظار میں مبتلا نہ رہو۔ جاؤ کھاؤ پیو اور مزہ کرو۔"

بعض لوگ اِدھر اُدھر چھپ گئے اور زیادہ چلے گئے۔ میں حیات خاں سے کہا۔ کیا ارادہ ہے۔ پہلے تو حیات خاں سوچتا رہا۔ پھر زیرِ لب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر سوال کیا۔ "چلتا ہے یا تماشا دیکھنا ہے۔"

"بھلا باباصاحب کو چھوڑ کے میں کہاں جاؤں گا!" حیات خاں بولا

گرمی کا موسم تھا۔ درختوں کا سایہ اور ٹھنڈی ہوا خمار کے طوفان اٹھا رہی تھی۔

تھوڑی دور ہٹ کر میں ایک گھنی جھاڑی کے نیچے لیٹ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر حیات خاں اس طرح بیٹھ گیا کہ نانا تاج الدینؒ کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہے۔

اب وہ دبیز گھاس پر لیٹ چکے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ فضا میں بالکل سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ جنگل بھیانک محسوس ہونے لگا۔ آدھ گھنٹہ پھر ایک گھنٹہ۔ اس کے بعد بھی کچھ وقفہ ایسے گزر گیا جیسے شدید انتظار ہو۔ یہ انتظار کسی سادھو، کسی جوگی، کسی ولی، کسی انسان کا نہیں تھا بلکہ درندہ کا تھا جو کم از کم میرے ذہن میں قدم بقدم حرکت کر رہا تھا۔ یکایک نانا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نگاہیں متوجہ ہو گئیں۔ ان کے پیروں کی طرف ایک طویل القامت شیر ڈھلان سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ بڑی آہستہ خرامی سے بڑے ادب کے ساتھ۔

شیر نیم وا کی آنکھوں سے نانا تاج الدینؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا دیر میں وہ پیروں کے بالکل قریب آ گیا۔

نانا گہری نیند میں بے خبر تھے۔ شیر زبان سے تلوے چھو رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس کی آنکھیں مستانہ واری سے بند ہو گئیں۔ سر زمین پر رکھ دیا۔

نانا تاج الدینؒ ابھی تک سو رہے تھے۔

شیر نے اب زیادہ جرأت کر کے تلوے چاٹنا شروع کر دیئے۔ اس حرکت سے نانا کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شیر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

کہنے لگے تو آ گیا۔ اب تیری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ میں تجھے تندرست دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ اچھا اب جاؤ۔ شیر بڑی ممنونیت سے دم ہلائی اور چلا گیا۔

میں نے واقعات پر بہت غور کیا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ شیر ان کے پاس آیا تھا۔ مجبوراً اس امر کا یقین کرنا پڑتا ہے، نانا اور شیر پہلے سے ذہنی طور پر روشناس تھے۔ روشناسی کا طریقہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ انا کی جو لہریں نانا اور شیر کے درمیان ردوبدل ہوتی تھیں وہ آپس کی اطلاعات کا باعث بنتی تھیں۔ عارفین میں کشف کی عام روش یہی ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جانوروں میں بھی کشف اسی طرح ہوتا ہے۔ کشف کے معاملے میں انسان اور دوسری مخلوق یکساں ہیں۔

یہ قانون بہت فکر سے ذہن نشین کرنا چاہئے کہ جس قدر خیالات ہمارے ذہن میں دور کرتے رہتے ہیں ان میں بہت زیادہ ہمارے معاملات سے غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قریب اور دوری کی ایسی مخلوق سے ہوتا ہے جو کائنات میں کہیں نہ کہیں موجود ہوں۔ اس مخلوق کے تصورات لہروں کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم ان تصورات کا جوڑا اپنی زندگی سے ملانا چاہتے ہیں تو ہزار کوشش کے باوجود ناکام رہ جاتے

ہیں۔ انا کی جن لہروں کا ابھی تذکرہ ہو چکا ہے ان کے بارے میں بھی چند باتیں فکر طلب ہیں۔ سائنس دان روشنی کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ اتنی تیز رفتار نہیں ہے کہ زمانی مکانی فاصلوں کو منقطع کر دے۔ البتہ انا کی لہریں لا متناہیت میں بیک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ زمانی مکانی فاصلے ان کی گرفت میں رہتے ہیں۔ باالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں ان لہروں کے لئے زمانی مکانی فاصلے موجود ہی نہیں ہیں۔ روشنی کی لہریں جن فاصلوں کو کم کرتی ہیں انا کی لہریں ان ہی فاصلوں کو بجائے خود موجود نہیں جانتیں۔

انسانوں کے درمیان ابتدائے آفرنش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی لہریں جن کے معنی معین کر لئے جاتے ہیں۔ سننے والوں کو مطلع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلہ کی نقل ہے جو انا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ کا عکس ہے جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال کو مطلع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انا کی لہریں کام کرتی ہیں۔ درخت بھی آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ دور دراز ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں اور مٹی کے ذروں میں من و عن اسی طرح تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

انبیاء اور روحانی طاقت رکھنے والے انسانوں کے کتنے ہی واقعات اس کے شاہد ہیں۔ ساری کائنات میں ایک لاشعور کافرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب و شہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے۔ چاہے یہ لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔ غیب و شہود کی فراست اور معنویت کائنات کی رگِ جاں ہے۔ ہم اس رگِ جاں میں جو خود

ہماری اپنی رگِ جاں بھی ہے تفکر اور توجہ کر کے اپنے سیارے اور دوسرے سیاروں کے آثار واحوال کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے تصورات جنات اور فرشتوں کی حرکات وسکنات، نباتات اور جمادات کی اندرونی تحریکات معلوم کر سکتے ہیں۔

سلسلۂ توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے سراپا کا معین پرت انا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز کو دیکھتا، سمجھتا اور شعور میں محفوظ کر دیتا ہے۔

پتے کیڑے بن گئے:

شکردرہ میں ناناتاج الدینؒ ایک درخت کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ گھنٹوں چپ رہتے، نگاہ نیچی کئے، گھٹنوں میں سر دیئے اسی طرح جس طرح کوئی مراقبہ کرتا ہو۔ لوگ ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور انتظار کرتے رہتے کہ وہ متوجہ ہوں۔ لیکن بعض دفعہ صبح سے شام ہو جاتی مگر ان کے سراپا میں کوئی حرکت نہ ہوتی۔ حاضرین بالآخر مایوس ہو کر واپس چلے جاتے۔

ناناعلیہ الرحمہ کی اس بے خودی کو حیات خاں چائے کی پیالی دے کر یا دوپہر کا کھانا پیش کر کے دور کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن بارہا ناکام ہو کر بی مریم کے پاس پہنچ جاتا۔ اور اپنے افسردہ لہجہ میں اپنی ناکامی کا تذکرہ کرتا۔ باباصاحبؒ نے صبح سے چائے نہیں پی۔ میرا تو بس نہیں چلتا اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ معلوم نہیں کہ آج وہ کھانا بھی کھائیں گے یا نہیں۔

اسکی بات سن کر بی مریم بھی دم بخود رہ جاتیں۔ دیر سوچتی رہتیں، پھر کہتیں یہ استغراق ہے۔ کمبخت باباصاحبؒ کے پیچھے پڑ گیا ہے۔

وہ دونوں انتظار کرتے رہتے۔ دو دو تین تین دن گزر جاتے اور ٹس سے مس نہ ہوتی۔ کھانا یا چائے تو ایک طرف پانی کا ایک قطرہ بھی ہونٹوں تک نہ جاتا۔ دو دراز سفر کر کے مہمان خانے میں پڑے رہتے۔ گرمی، سردی، بارش کی شدت برداشت کرتے۔ لیکن بغیر حاضری کے جانے کا نام نہ لیتے۔ حیات خاں کا خیال تھا کہ باباصاحبؒ کے استغراق کی کشش لوگوں کے ذہن میں انبساط کی لہریں پیدا کرتی ہیں۔ اس کو یقینِ کامل تھا کہ لوگوں کی خوشی کا ایک مرکز ضرور ہوتا ہے۔ جو ان کی اپنی ذات سے باہر خدا سے یا کسی شخص سے وابستگی رکھتا ہے۔ دراصل حیات خاں عقیدت مندی کی مسرتوں سے بہت زیادہ مانوس تھا۔ اسی باعث وہ بطور خاص اس تاثر کو تلاش کرتا اور لوگوں کے انتظار سے لطف اندوز ہوتا۔ حالتِ استغراق میں ناناتاج الدینؒ کی آنکھیں کچھ کھلیں رہتی تھیں۔ حیات خاں اکثر ان کی نیم باز آنکھیں عجیب ذوق و شوق سے دیکھتا۔ ایک مرتبہ استغراق کی حالت میں حیات خاں نے مجھے اشارہ سے بلایا۔ کہنے لگا کہ اس پتہ کو دیکھو۔ میری نظر یکے بعد دیگرے کئی پتوں پر گئی۔ جس پتے کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ اس میں سے ٹانگیں چہرے کے خدوخال اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں رونما ہو رہی تھیں۔ یہ پتہ تقریباً تین انچ لمبا ہوگا، یکا یک میری نظریں برابر والے پتے پر جاپڑیں۔ اس میں بھی ویسا ہی تغیر ہو رہا تھا۔ یہ دونوں پتے ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگے۔ ایک دو منٹ میں ان کی ہیئت بھی بدلی۔ اتنی بدلی کہ پتوں کی کوئی شباہت ان میں باقی نہیں تھی۔ وہ درخت کے تنے کی طرف چلے جا رہے تھے اور ناناتاج الدینؒ کی نیم وا آنکھیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ اس واقع کے بعد حیات خاں کئی دن تک ایک بھجن گنگناتا رہا۔ جو اس بول سے شروع ہوتا ہے۔

پربھو دھن، دھن قدرت تیری

کئی مہینے بعد میں نے نانا سے اس کی علمی توجیح معلوم کی۔ فرمایا۔ "ارے تو سمجھ بھی سکے گاً۔ دیکھ یہ درخت ہے۔ اس کے اندر زندگی کے سارے ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ دیکھنا، سننا، سمجھنا، جنبش کرنا، یہ سب ٹکڑے اس درخت کے اندر جھانکنے سے نظر آتے ہیں۔ اس کے ہر پتے میں سچ مچ کا منہ ہے، سچ مچ کے ہاتھ پیر ہیں، فرق اتنا ہے کہ جب تک پتہ دوسری زندگی سے ٹکراتا نہیں اسکے اندر عام لوگ یہ نیرنگ دیکھ نہیں سکتے اور جب کوئی پتہ میری زندگی سے گلے ملتا ہے تو جیتا جاگتا کیڑا بن جاتا ہے۔ یہ سمجھ کہ آنکھ سے گلے ملتے ہیں۔ یاد رکھ زندگی سے زندگی بنتی ہے۔ اور زندگی زندگی میں سماتی ہے۔"

دیوار میں سے گزر جانا:

جس زمانہ میں والد صاحب دلی ٹول ٹیکس میں محرر تھے، ہمارے مکان کی ایک دیوار بارش میں گر گئی۔ مکان دار برسات میں مرمت کرانے کے لئے تیار نہ تھا۔ نانا تاج الدینؒ نے والد کو خط لکھا کہ بھابی اور بیٹی سعیدہ کو ناگپور پہنچادو۔ ان ایام میں وہ راجہ رگھوراؤ کے پاس مقیم تھے۔ ہم لوگوں کے لئے شطرنج پورہ میں رہائش کا انتظام کیا گیا۔ روزانہ یا دوسرے دن نانا اپنی گھوڑا گاڑی میں یہاں تشریف لاتے۔ گھنٹوں ہمارے ساتھ گزارتے۔ اکثر ارد گرد کی آبادی کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ نانا ان کے معاملات پر غور کرنے میں اتنا دماغ صرف کردیتے کہ حواس ماؤف ہوجاتے۔ ایک بار بے خیالی میں دروازے کی طرف جانے کی بجائے وہ دیوار کے پیچھے کھڑی ہوئی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھتے چلے گئے اور ٹھوس دیوار سے گزر کر سڑک پر نکل گئے۔ غالباً یہ کرامت ان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوئی۔ لوگوں کے معاملات سے متعلق سوچنے میں ان کا ذہن تجلی

الٰہی میں تحلیل ہو گیا اور جسم ذہن کے تابع ہونے کی وجہ سے ثقل کی منزل سے آگے نکل گیا۔

دو برس کا چلہ:

ناناتاج الدینؒ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد ساگر ڈپو میں تعینات کئے گئے۔ رات کے ۹ بجے گنتی سے فارغ ہو کر بابا داؤد مکی کے مزار پر تشریف لے جاتے۔ وہاں صبح تک مراقبہ اور مشاہدہ میں مصروف رہتے اور صبح سویرے پریڈ کے وقت ڈپو پہنچ جاتے۔ یہ مشغلہ پورے دو برس تک جاری رہا۔ دو برس بعد ہی ہفتہ میں ایک دو بار ان کے یہاں حاضری ضرور دیا کرتے تھے۔ جب تک ساگر میں رہے اس معمول میں فرق نہیں آیا۔ چلہ کشی کے ابتدائی دور میں زواٹ نام کا ایک مغلوب العضب کرنل ڈپو کا کمانڈر مقرر ہوا۔ شدہ شدہ نانا کا رات کے وقت مزار پر جانا اس کو بھی معلوم ہو گیا۔ چنانچہ یونٹ صوبہ دار سے بازپرس کی نوبت آگئی۔ یہ ساداتِ بارہ میں سے تھا اور مزاج کا بڑا سخت تھا۔ اس نے کمانڈر سے بالکل صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں اپنے فرد کا خود ذمہ دار ہوں۔ جب تک سرکاری کاموں میں حرج واقعہ نہ ہو میں کسی کے نجی معاملہ میں دخل نہیں دے سکتا۔ رہا رات کے وقت ڈپو سے باہر جانے کا مسئلہ تو اس کے لئے ان کو پاس ملا ہوا ہے۔

مسلسل دو برس تک تمام رات جاگنا اور تمام دن کام کرنا بھی ان کی کرامت ہے۔

ایک صحابیؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں اپنی طویل شب بیداری کے تذکرے میں عرض کیا۔ "یارسول اللہؐ! میں آسمان پر فرشتوں کو چلتے پھرتے دیکھتا تھا۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو شب بیداری کو اور قائم رکھتے تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔

اس روایت کی روشنی میں اگر ناناتاج الدینؒ کی مسلسل شبِ بیداری پر غور کیا جائے تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غیبی مشاہدات ان کا معمول بن گئے تھے۔ انکے کئی دوہے اسی مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے۔

سائے بن کی رات میں بن باسی بن جائیں
داس ملو کا ساتھ میں جاگیں اور لہرائیں

مطلب جنگل کی رات میں سائے آدمی بن جاتے ہیں۔ تاج الدینؒ ان کے ساتھ میں جاگتے رہتے ہیں۔ اور خوش گپیاں کرتے رہتے ہیں۔

نانا کویتا میں اپنا نام داس ملو کا لیا کرتے تھے۔

تنکے بیڑی بن جاتے تھے:

تحقیق و تلاش کے بعد بھی ناناتاج الدینؒ کا سالِ پیدائش معلوم نہیں ہو سکا۔ بڑے نانا کی حیات میں مجھے زیادہ ہوش نہیں تھا۔ والد صاحب کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے بڑے نانا کی زبانی یہ سنا ہے کہ تاج الدینؒ کی عمر غدر میں چند سال تھی۔ لڑکپن میں انہیں پڑھنے کے علاوہ کوئی شوق نہیں تھا۔ بیڑی پینا کب سے شروع کیا اس کے بارے میں صحیح بات معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ شکردرہ کے قیام میں بیڑی اور چائے کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ بعض اوقات بیڑیاں ختم ہو جاتی تو بیڑ کا کوئی پڑا گرا ٹکڑا اٹھا

لیا کرتے تھے۔ کسی وقت بیڑی کا ٹوٹا بھی نہیں ملتا تھا۔ پھر ان کی طبیعت خرقِ عادات کی طرف مائل ہو جاتی۔ جو تنکا ہاتھ آجاتا اس کو سلگا لیتے۔ لوگوں نے بار بار دیکھا کہ تنکے نے بیڑی کی شکل اختیار کر لی۔ اور بیڑی کی طرح دھواں دینے لگا۔

لنگڑا بیساکھی چھوڑ بھاگا:

ایک لنگڑا نوجوان شفاخانے میں آکر ٹھہر گیا۔ یہ شفاخانہ بھی مسجد اور مدرسہ کی طرح پھونس کی جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ لنگڑا صبح کھا پی کر شفاخانے سے چلتا اور ناناتاج الدینؒ کے سامنے آبیٹھتا۔ سلام کر کے لنگڑی ٹانگ پھیلا کر اپنا ہاتھ پھیرنے لگتا۔ اور ایسے منہ بناتا جیسے بڑی تکلیف میں ہے۔ ناناہوں کہہ کر چپ ہو جاتے۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ لنگڑا تھا بڑا اڑیل۔ اپنے معمول پر قائم رہا۔ ایک روز میں بھرا ہوا آیا اور نانا کی طرف دیکھ کر بڑبڑانے لگا۔ خدا نے مجھے لنگڑا کر دیا ہے جن کی ٹانگیں ہیں ان کو کچھ احساس نہیں۔ سنا تھا کہ خدا کے یہاں انصاف ہے، انصاف کو بھی جھنجھوڑ کر دیکھ لیا۔ سب ڈھونگ ہے۔ لوگ خدا خدا پکارتے ہیں اور خدا بہرہ ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں سنتا۔ خدا والوں کو بھی دیکھ لیا۔ یہ بھی سب گونگے بہرے ہیں۔ خدا اور خدا والوں سے تو میری بیساکھی اچھی ہے۔ سہارا تو دیتی ہے۔

نانا اس کی بات سن کر جھنجھلا گئے۔ چیخ کر بولے۔ "جادفان ہو۔ بھلا چنگا ہو کر لنگڑا بنتا ہے۔ جھوٹا کہیں کا۔" یہ کہہ کر لنگڑے کو مارنے کے لئے دوڑے۔ لنگڑا بیساکھی چھوڑ بھاگا۔ اب اس کی لنگڑی ٹانگ بالکل ٹھیک تھی۔

انسان علی شاہ نانا کے فیض یافتہ تھے۔ ان کو روحانی علوم پر عبور تھا اور سوچنے کی طرزیں بھی نانا سے ملتی تھیں۔ انہوں نے نانا کی حیات میں ترکِ وطن کر کے شکر درہ میں

سکونت اختیار کرلی تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے لنگڑے کا یہ واقعہ زیرِ بحث آگیا۔ انسان علی شاہ کہنے لگے۔ اس واقعہ کی توجیح مشکل نہیں۔ یہ سمجھنا کہ کائنات ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے غلط ہے۔ یہاں ہر چیز صدوری طور پر ہوتی ہے۔ وقت صرف انسان کی اندرونی واردات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی شئے اندرونی واردات کی حد سے باہر نہیں۔ تغیر اور ارتقاء کے مرحلے اندرونی واردات ہی کے اجزاء ہیں۔ یہ واردات ہی نوعی سراپا کی نقلیں افراد کی شکل و صورت میں چھاپتی ہیں۔ چھپائی کی رفتار معین ہے۔ اسی رفتار کا نام وقت ہے۔ اگر اس رفتار میں کمی بیشی ہو جائے تو لنگڑا، لولہ، اندھا چھپنے لگتا ہے۔ حوادث اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ جب عارف کا ذہن ایک آن کے لئے ایک صدوری کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے تو یہ بے اعتدالیاں دور ہو جاتی ہیں۔

گوالہ زندہ ہو گیا:

گلاب سنگھ نے ناناتاج الدینؒ کی چائے کے لئے ایک بھینس کا دودھ وقف رکھا تھا۔ اکثر خود ہی دودھ لے کر آتا اور چھان کر جوش کرنے کے لئے رکھ جاتا۔ وہ سن ۱۱ سے یہ خدمت انجام دیتا تھا۔ سن ۱۷ کی برسات میں ایک صبح دودھ نہیں آیا۔

نانا نے دن چڑھے تک انتظار کرنے کے بعد حیات خاں سے کہا۔ "کیا آج چائے نہیں ملے گی۔"

حیات خاں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "میں تو بہت سویرے سے گلاب سنگھ کا انتظار کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں کیا بپتا پڑ گئی۔ ابھی تک وہ دودھ نہیں لایا۔ حکم ہو تو بازار سے لے آؤں۔"

نانا بگڑ کر بولے۔ "پھر تو نے اس کی خبر کیوں نہیں لی؟ جا کے آ۔" حیات خاں گاؤں کی طرف دوڑا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر گلاب سنگھ کی ارتھی پر پڑی۔ لوگ کریا کرم کے بندوبست میں لگے ہوئے تھے۔ اس میں ایک آواز سنی۔ باباصاحبؒ کا گوالہ مر گیا۔

حیات خاں پریشان ہو کر الٹے پاؤں دوڑا۔

نانا تاج الدینؒ راستے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر گلوگیر آواز میں بولا۔ "گلاب سنگھ مر گیا۔"

نانا یہ سن کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ حیات خاں اور چند آدمی ان کے ساتھ تھے۔ آنکھوں سے جلال برس رہا تھا۔ ارتھی کے قریب پہنچ کر انہوں نے پکارنا شروع کیا۔ "گلاب سنگھ، گلاب سنگھ۔"

بہت غصہ میں ہجوم سے بولے۔ "اسے کھول دو، یہ زندہ ہے۔"

اس کے بھائی نے دوڑ کر ارتھی کی دوریاں کاٹ ڈالیں۔ آن کی آن میں گلاب سنگھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن گلاب سنگھ حسبِ معمول دودھ لے کر آیا تو لوگوں نے اسے گھیر لیا اور سوالات کی بوچھار کر دی۔

اب سنئے گلاب کی کہانی اس کی اپنی زبانی۔

"بوندوں میں بھیگنے سے مجھے تپ چڑھ گئی۔ بدن جلنے لگا۔ کچھ لوگ اڑتے ہوئے آئے اور مجھے اس دنیا سے دوسری دنیا میں لے گئے۔ میں کئی گھنٹے تک ایک ہرے بھرے میدان میں گھومتا رہا۔ اس کے دو راستے تھے۔ ایک راستے کانٹے دار جنگل میں گم ہو گیا اور دوسرے راستے میں آبادیاں تھیں۔ چلتے چلتے میں ایسی جگہ پہنچا جہاں بہت سی

عدالتیں لوگوں سے بھری پڑی تھیں۔ انہی عدالتوں میں اونچی کرسی کی ایک عمارت دیکھنے میں آئی۔ جس کے دروازے بڑے بڑے تھے۔

میں نے دیکھا باباصاحبؒ ایک دروازے میں کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں۔ پھر وہ محراب کی طرف بڑھے۔ یہاں تخت پر دوجگ کے تاج دار انبیاء کے سردار (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف رکھتے تھے۔ بابا صاحبؒ تخت کے سامنے ٹھہر گئے۔ اور سر جھکا کر درخواست کی۔

میرے آقا، گلاب سنگھ کی واپسی کا حکم دیا جائے۔

نہیں بارگاہِ نبوی سے ارشاد ہوا۔

باباصاحبؒ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ چند منٹ بعد ہونٹوں کو جنبش دی۔

اگر یہ درخواست قبول نہیں ہو سکتی تو غلام حضور کے بخشے ہوئے پیرہن کا مستحق نہیں۔ یہ کہہ کر باباصاحبؒ کرتہ اتارنے لگے۔

سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے ایک نظر دیکھ کر فرمایا۔

"گلاب سنگھ، تم جا سکتے ہو۔"

منقبت

(بحضور تاج الدین اولیاء۔ باباتاج الدین ناگپوریؒ)

یا باباتاج الدینؒ ولی، تم زلفِ نبیؐ، گیسوئے علیؓ
تم لاڈلے بی بی زہراؓ کے، تم روئے حسینؓ ابروئے علیؓ
پروردۂ نازِ خدا تم ہو، سرکردۂ رازِ خدا تم ہو
گلزارِ نیازِ خدا تم ہو، خوشبوئے حسنؓ خوشبوئے علیؓ
اس دور کے اندر جانا ہے، اس دور کے اندر سمجھا ہے
تم سے ہے جمال مصطفویؐ، تم سے ہے جلالِ خوئے علیؓ
تم ختمِ رسل کا نقشِ قدم، تم شمعِ عرب، تم شمع عجم
تم سرِّ خفی و جلی باہم، مہکی ہے تم سے بوئے علیؓ
یہ آپ ہی کا تو نواسہ ہے، دریا پی کر جو پیاسہ ہے
جلووں کا سمندر دے دیجئے، اے بادۂ حق اے جوئے علیؓ
قلندر بابا اولیاءؒ